رام لعل

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

گلی گلی
(افسانے)

رام لعل

مصنّف: نئی دھرتی پرانے گیت، انقلاب آنے تک وغیرہ

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ ہیں

ناشر:- ایس بترا

سن اشاعت:- جنوری ۱۹۶۰ء

مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

قیمت:- چار روپئے

باہتمام:- پنچ پبلشرز۔ سروری منزل
امین آباد۔ لکھنؤ

۵	او، سی
۱۵	ہسٹری شیٹر
۲۵	نصیب جلی
۳۷	ابرِ محیط
۵۱	راکھ
۶۳	ہمسفر
۷۱	دس، بیس، تیس اور سو
۸۱	روشنی اور سائے
۹۷	چمار
۱۱۳	سورج، چاند، ستارے
۱۳۳	نیند نہیں آتی
۱۴۹	اِبّا
۱۶۳	سنکٹ
۱۷۹	دشتِ دل
۱۹۵	تیرے منھ میں خاک

ایک شفیق بزرگ و خوش ذوق انسان لالہ رمیلداس کھیڑا کے نام

۵

اوسی

۱۹۵۹ء

اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کے سامنے چار اشخاص کھڑے تھے۔ سینئری انسپکٹر، کلیم انسپکٹر، ریلوے پروٹیکشن انسپکٹر اور اسٹیشن ماسٹر خود۔ اسٹیشن ماسٹر اور ریلوے پروٹیکشن انسپکٹر اپنی اپنی تازہ پریس شدہ وردی پہنے ہوئے تھے۔ باقی دو صاف ستھرے کپڑوں میں تھے۔ چاروں بے حد مضطرب تھے۔ ایک ہی سمت سب کی نگاہ جمی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم کے کونے پر، جہاں متوازی آہنی پٹری کی ایک شاخ ایک بند کونے کی طرف نکل گئی تھی۔ وہاں شنٹنگ انجن ایک چھوٹی، نئی نئی روغن کی ہوئی چار پہیوں کی آفیسرس کوچ کو آہستہ آہستہ ٹھوکر کے قریب لے جا رہا تھا۔ کوچ کے پیتل کے ہینڈل دھوپ میں چمک رہے تھے۔ فٹ بورڈوں پر نئے فٹ پیڈ لگے ہوئے تھے۔ فٹ بورڈوں کے قریب جہاں پہیئے اور دوسرے بھاری کل پرزے لگے ہوئے تھے، وہاں سفید روغن کیا گیا تھا تاکہ اندھیرے میں بھی خطرے کی جھلک دکھائی دے جائے۔ وہ گاڑی ایک بڑے ریلوے افسر کی ریزرو کوچ تھی جسے عرف عام میں او۔سی بھی کہتے ہیں۔ او۔سی کے سب دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔

اسٹیشن ماسٹر اپنے کلین شیو چہرے پر سے بار بار پسینے کی نمی پونچھتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے ہم لوگ وہاں جا کر صاحب کو ریسیو کریں۔"

سینئری انسپکٹر نے رائے ظاہر کی۔" میں سمجھتا ہوں وہ ابھی اندر آرام فرمائینگے

دس بجے سے پہلے باہر نہیں آئیں گے ۔"

کلیم انسپکٹر نے بھی اُس کی رائے کی تائید کی ـــــ پر وٹیکسن انسپکٹر خاموش رہا ان سب کے چہرے غور سے دیکھ کر اپنی یونیفارم کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد اپنے دفتر کی طرف گردن گھما کر دیکھا جس کے سامنے دوسینک بڑی مستعدی سے کھڑے تھے۔

اسٹیشن ماسٹر کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ متفق نہیں تھا۔لیکن خود وہاں تنہا جانے کا فیصلہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اچانک وہ اسٹیشن کے مختلف دفتروں کا معائنہ کرنے کے لیے چل پڑا کہ کہیں کوئی ایسی خامی نہ رہ گئی ہو جس کی وجہ سے اُسے اپنے افسر کے سامنے جوابدہ ہونا پڑ جائے !

پہلے وہ سیدھا ٹکٹ گھر میں گیا۔تین کلرک تین کھڑکیوں پر یونیفارم پہنے مسافروں کو ٹکٹ بانٹنے میں مصروف تھے۔ ایک کلرک کے کوٹ کے کھلے ہوئے بٹن دیکھ کر اُسے ڈانٹ دیا۔ اور اُن کے انچارج کو تنبیہ کی کہ سب کام ٹھیک رہنا چاہیئے ـــ ! ادھیڑ عمر انچارج کرسی پر سے "یس سر" کہتا ہوا اُٹھا تو اُس کی ننگی ٹانگیں دیکھ کر اسٹیشن ماسٹر حیران رہ گیا۔ حیران بھی اور غصے سے سُرخ بھی !

"یہ کیا بدتمیزی ہے ؟"

اُس نے بدن پر قمیص، کوٹ اور نیچے صرف انڈرویر پہن رکھا تھا۔ سیاہ لمبی ٹانگیں بالکل عریاں تھیں، بغیر پالش کے کُھلے گِھسے ہوئے بوٹوں کے اندر سردی سے کانپ رہی تھیں۔

"سرکار، مجھے پچھلے چار سال سے کُل یونیفارم نہیں ملی۔ کتنی بار اسٹور کلرک کی

شکایت کر چکا ہوں، کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے آج ڈی۔ سی۔ او صاحب کے سامنے اسی حالت میں جاؤنگا۔"

"یہ ڈسپلن کے خلاف ہے! ڈسمس کر دیے جاؤ گے، بتا دوں!"

"ٹھیک ہے میں محکمے کی غلطی کی بناء پر ڈسمس ہونے کے لیے تیار ہوں اس کے بعد عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر انصاف کرالوں گا۔"

یہ سب دیکھ کر بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ ریل کے بابو بھی اور مسافر بھی۔ ایک پڑھے لکھے مسافر نے آگے بڑھ کر کہا: "آج میں بھی آپ لوگوں کے آفیسر سے ملونگا۔ میں ریل کی بدانتظامیوں سے تنگ آ چکا ہوں۔"

اسٹیشن ماسٹر وہاں سے کھسک کر مسافر خانے میں گیا۔ ٹی اسٹالوں کی صفائی میں مین میخ نکالی نالیوں اور کونوں کھدروں میں چونا پڑا ہوا نہ دیکھ کر سینٹری انسپکٹر کو بلا بھیجا۔ پھر قلیوں کے ٹھیکیدار سے مل کر اس بات کا اطمینان حاصل کیا کہ اسٹیشن کے احاطے میں کوئی قلی بلا نمبر اور بغیر وردی کے نہیں تھا۔ وہاں سے ہوتا ہوا وہ اپنے اسسٹنٹ کے پاس گیا جو اپنے دائیں بائیں بھاری بھاری کنٹرول مشینوں اور آگے میز پر پڑے کئی ٹیلیفونوں کے درمیان بیٹھا ہوا مسلسل بول رہا تھا دو فونوں پر بیک وقت باتیں کر رہا تھا۔

"ہاں ہاں! چار نمبر سگنل ڈراپ کر دو۔ ہیلو! فورڈ اون پاس ہوگئی؟ ہیلو! یس یس! چھ نمبر خالی ہے! ہیلو! لائن کلیر بھیج رہا ہوں۔ ہیلو! ہیلو!!"

مسلسل کئی منٹ تک وہ اسٹیشن ماسٹر سے بات کرنے کی فرصت نہیں نکال سکا تو اسٹیشن ماسٹر باہر آگیا۔ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر پھر نگاہ جمائی وہاں

او۔سی لگادی جا چکی تھی۔ اس کے دروازے ابھی تک بند تھے۔ او۔سی کی جانب پلیٹ فارم پر گھومتے ہوئے کتنے ہی لوگ گھور رہے تھے۔

معاً اُس کی نگاہ مس بھوشن پر پڑی۔ وہ ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے او۔سی کی طرف جا رہی تھی۔ اُسکا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی بات ہے! اُسے بلانے کے لیے ایک پورٹر کو دوڑایا وہ لوٹ کر آئی تو پوچھا۔" کہاں جا رہی ہو؟"

"صاب سے ملنے۔"

"کیوں؟"

جوان سانولے رنگ کی لمبے بالوں والی مس بھوشن نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑی بڑی گہری آنکھوں میں آنسو بھر لیے اور سر گھما کر ایک طرف دیکھنے لگی۔

"بتاؤ نا مس بھوشن! بات کیا ہے آخر؟"

"آپ کو معلوم ہے مجھے میرے ساتھی ٹکٹ کلکٹر کس قدر پریشان کرتے رہتے ہیں۔ ساتھی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ عورت کی کوئی عزت ہی نہیں ہے!" یہ کہتے کہتے وہ بیچاری رو بھی دی۔

اسٹیشن ماسٹر گھبرا کر بولا۔" تمہیں سنگھ پریشان کرتا ہے نا! اُسے تو میں نے ایک بار ڈانٹا بھی تھا۔ کیا وہ ابھی تک باز نہیں آیا؟"

"یہاں سب پریشان کرتے ہیں چھوٹے سے لے کر بڑے تک۔ کیونکہ عورت جو ہوں! آج میں صاب سے کچھ نہ کچھ فیصلہ کرا کے ہی رہوں گی۔"

اُسی وقت وہاں ایک نوجوان وردی پوش کلرک آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں بھی ایک درخواست تھی۔ اسٹیشن ماسٹر کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔" جناب

اِس کو ذرا فارورڈ کر دیجیے۔"

"کیا ہے یہ؟"

"میرا پچھلے تین مہینوں سے کوارٹر کا کرایہ کٹ رہا ہے جبکہ میں اب کوارٹر میں رہتا بھی نہیں ہوں۔ کم تنخواہ ملنے کی وجہ سے میرے سر پہ دو سو روپیے کا قرض چڑھ چکا ہے۔ آج صاب سے ملوں گا۔"

"تو تم سمجھتے ہو صاب تمہیں اپنی جیب سے روپئے نکال کر دے دینگے!"

"وہ کچھ نہیں کرینگے تو میں اُن کی او-سی کے آگے لیٹ جاؤنگا۔ اپنی بات منوائے بغیر انہیں یہاں سے جانے ہی نہیں دونگا۔"

وہاں اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اسٹیشن ماسٹر پیچھا چھڑاتے ہوے بولا۔" چلو بھائی سب لوگ صاب سے مل لو۔ میں کسی کو روک تھوڑی سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے کھسکا۔ پانی پلانے والے پورٹروں کو سخت نظروں سے گھورا جو ایک جگہ اکٹھے بیٹھے ہنس رہے تھے۔ خوانچے والوں کے خوانچوں کے اندر جھانک کر دیکھا جو اپنی چیزوں کو صاف کرنے اور چمکانے میں مصروف تھے۔ ان کی ریٹ لسٹ، لائسنس نمبر اور پہنی ہوئی وردی دیکھتا ہوا پان کی ایک گلوری گلے میں دباتا مال گودام کی طرف چل دیا۔ وہاں کا جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔

مال گودام اسی طرف تھا جدھر آفیسر کی کوچ رُکی ہوئی تھی۔ قریب پہنچ کر کوٹ کے سب بٹن بند کر لیے۔ ٹائی کی گانٹھ ٹھیک کی اور سر پہ جما یا ہوا سفید ہیٹ بھی۔ کوچ کے کچن میں سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ صاب کے لیے

چائے تیار ہو رہی ہو گی! اُس نے اندازہ لگایا۔ لیکن ابھی تک اُن کا چپڑاسی یا باورچی باہر نہیں نکلا تھا سب اندر مشغول ہونگے!

او.سی کے سامنے جو بھی گزرتا تھا سانس روک لیتا۔ ہولے ہولے قدم رکھتا۔ کہیں او.سی کے اندر ان کے پاؤں کی چاپ نہ سُنائی دے جائے۔ اسٹیشن ماسٹر بھی اُسی انداز سے پنجوں کے بل چلتا ہوا سامنے سے گزر گیا۔ مال گودام کا جائزہ لینے کے بعد لوٹا تو اپنے ایک پورٹر کو او.سی کے سامنے ایک پانچ سال کا بچہ اُٹھائے ہوئے دیکھا۔ خوب گورا چٹا۔ انگریزی فیشن کے سنہرے بال سفید کھدر کا کرتہ اور پائجامہ پہنے۔ ایک کر آہستہ سے سرگوشی میں پوچھا۔

"کیا صاب کے بال بچے بھی ساتھ ہیں؟"

"جی یہ چھوٹے صاب ابھی باہر آئے تو میرا جی چاہا انہیں اُٹھا لوں!"

"لاؤ میں اُٹھاؤں اب۔ تم بھاگ کر بسکٹ لے آؤ۔ پورا پیکٹ لے آنا، کریم والے! میرا نام لیکر! سمجھے!"

"جی اچھا!"

بچہ اب اسٹیشن ماسٹر کی گود میں تھا۔

"ڈیڈی کیا کر رہے ہیں اندر؟ تمہارا نام کیا ہے؟ ہیلو بے بی!"

اتنا پیار کرنے اور پچکارنے پر بھی بچہ خاموش رہا۔ اُسے بس گھورتا رہا۔ گود میں اُٹھا لینے پر اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسٹیشن ماسٹر مسکراتا ہوا آہستہ آہستہ اپنے دفتر کی طرف بڑھا۔ جہاں اُسکی گود میں بچہ دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔

اسٹیشن کا اسٹاف بہت عجیب تھا۔ آج اُن کا اپنے کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار باہر نکل کر جمع ہونے لگتے تھے جیسے کوئی تماشہ ہونے والا ہو۔ یا پہلے انہوں نے اپنے افسر کو کبھی دیکھا ہی نہ ہو!

اسٹیشن ماسٹر نے سب کو ڈانٹ دیا۔ جب پورٹر بسکٹ لے آیا تو سارا پیکٹ بچے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ۔" کھاؤ گے بے بی؟ کھول دوں؟"

بچے نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا تو اُس نے ہنسکر کہا:" اچھا اچھا! بے بی بہت اچھا ہے!! اسے ڈیڈی اور ممی کے پاس لے جائے گا۔ ہیں نا — اتیج! لیجاؤ۔ جاؤ گے؟ اچھا چلو۔ بے بی کو او۔سی کے پاس چھوڑ آئیں۔ ڈیڈی سے میرا سلام بولنا بے بی! سمجھے بے بی۔ کہنا — اسٹیشن ماسٹر سلام بولتا ہے۔ کہو گے نا؟"

جو لوگ اپنی غلطیوں کی بنا پر خوفزدہ تھے وہ سامنے نہیں آرہے تھے۔ دل ہی دل میں دعا مانگتے پھرتے تھے کہ صاب کا قدم اُن کے دفتر میں نہ پڑے کسی طرح! جنہیں اپنی شکایات پیش کرنی تھیں وہ اسٹیشن ماسٹر کے پیچھے پیچھے او۔سی کی طرف جانے لگے۔ اسٹیشن ماسٹر کے منع کرنے پر بھی پیچھے پیچھے بڑھتے رہے او۔سی کے عین سامنے اُن کا ہجوم ہو گیا۔ اُن کے بولنے کی آوازیں بھی اونچی ہو گئیں۔ سب کے آگے اسٹیشن ماسٹر تھا۔ بچہ ابھی تک اُسکی گود میں تھا۔

اچانک دروازے کا چمکتا ہوا ہینڈل ذرا سا ہلا۔ اسے دیکھ کر سب لوگ ایک ساتھ چونک گئے۔ خبردار ہو گئے۔ اپنے بٹن، پگڑیاں، ٹوپیاں اور ہیٹ سہلائے۔ پھر دم بخود ہو کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ کچن کی چمنی میں سے

دھواں نکلنا بند ہو چکا تھا۔ صاب نے چائے پی لی ہوگی۔ اسب نے یہی سوچا اب وہ باہر آکر اسٹیشن کا معائنہ کریں گے۔ وہ بالکل غیر متوقع طور پر یہاں آگئے تھے سال میں ایک آدھ بار ایسا ہوتا رہتا تھا۔ آج سب لوگ انہیں کوئی دوسرا کام نہیں کرنے دیں گے پہلے اپنی شکایات سُنائیں گے۔ بہت سی شکایات — وقت پر تنخواہ نہ ملنے کی، کوارٹروں کی، چھٹیوں کی، بیماریوں کی، زندگی کے بالکل لاچار، بالکل بے بس ہو جانے کی، جنہیں دور کرنا یا دور کر دینے کا جتن کرنا صاب کے اختیار میں تھا۔

دروازے کا چمکتا ہوا سنہرا ہینڈل جو ایک بار حرکت کر کے ساکت ہو گیا تھا اب پھر ہلا۔ اندر سے ہولے ہولے کھانسنے اور چلنے کی آواز سُنائی دی۔ سب لوگوں نے سانس روک لی صرف دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔

دروازہ بھی ہلا۔ اندر کی طرف کھنچ گیا۔ پھر آدھا کھُل گیا۔ اندر سے ایک باوردی چپراسی سرک کر، بہت احتیاط سے باہر آگیا۔ سب کی طرف گہری نظر سے تاکتا ہوا۔ صاب کے ساتھ رہ کر اُس نے ایسے ہجوم کئی بار دیکھے تھے۔ باہر آکر اُس نے دروازہ پھر بند کر لیا تھا۔

"صاب ابھی باہر نہیں آئیں گے؟"

اسٹیشن ماسٹر بچے کو اُسی طرح اُٹھائے اُٹھائے چپراسی کے قریب گیا چپراسی نے اسٹیشن ماسٹر کو گود میں بچہ اُٹھایا ہوا دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ مسکرا کر اور اُسے سلام کر کے بولا۔" حضور آپ نے بہت تکلیف کی! لائیے مجھے دید یجیئے اب!"

" نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ میری گود میں بہت خوش ہے بے بی۔ یہ بتاؤ

صاب کیا کر رہے ہیں؟ کس وقت باہر آئیں گے؟" اسٹیشن ماسٹر چاہتا تھا جس وقت صاحب باہر نکلیں وہ بچّے کو اسی طرح اُٹھائے ہوئے ہو۔

"صاب!" چپراسی کے چہرے پر قدرے حیرانی جھلکی۔ پھر مسکرا کر بولا "صاب تو نہیں ہیں اندر!"

"کیا صاب اندر نہیں ہیں؟" قریب قریب سب لوگ چیخ اُٹھے۔

"جی نہیں وہ تو صبح ہی او۔سی چھوڑ کر ایئر انڈیا سے آگرہ چلے گئے تھے اپنے بال بچّوں کے پاس۔ او۔سی تو صرف یہاں آج کا بھتّہ بنانے کے لیے چھوڑی گئی ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر کے چہرے پر ایک گہرا اطمینان جھلکا۔ وہ بچّے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بے بی کو یہاں اکیلا کیوں چھوڑ گئے صاب!"

"اسے؟" چپراسی شرما کر مسکراتے ہوئے بول اُٹھا ــــ "یہ تو حضور آپ کا بچّہ ہے!"

مسٹری شیٹر

۱۹۵۵ء

جب فلم کا آخری شو ختم ہوا باہر سخت بارش ہو رہی تھی میں تانگے کی پچھلی سیٹ پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹا ہوا تھانے کی طرف چلا۔ میری خاکی وردی کا کچھ حصہ بھیگ گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے سے کچھ سردی کا بھی احساس ہوا۔ سر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بڑے زور کی بجلی چمک رہی تھی۔ رات بھر بارش ہونے کا امکان تھا۔ تانگے والے سے کہا۔

"رپھرایا!"

"جی"

"جلدی کیوں نہیں چلتا تیرا گھوڑا؟"

"حضور اس کی ٹانگیں زخمی ہیں۔ پرسوں کچہری سے لوٹتے وقت پھسل گیا تھا"

مجھے اس کی وضاحت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اُچک کر اگلی سیٹ پر آ بیٹھا۔ مونچھیں سہلائیں۔ چابک ہاتھ میں لے کر گھوڑے کی کمر پر پے در پے چھ وار کر دیئے۔ گھوڑا تڑپ کر لڑکھڑایا اور پھر بھاگنے لگا۔ میں نے دیکھا پھرایا بھی اُسی دم تڑپ اٹھا تھا لیکن جب چاپ پائدان سے لگا سہما ہوا بیٹھا رہا تھا۔

چوڑی خاموش سڑک پر جس کے ایک طرف ریلوے کا یارڈ تھا۔ پستہ قد دیوار تھی اور دوسری طرف موٹیل آئیل، خراد مشینیں، لوہے کا الم غلم سامان بیچنے والوں کی

دُکانیں تھیں، گھوڑے کی اونچی اونچی ٹاپیں گونج رہی تھیں۔ زور زور سے بوندیں پڑنے سے موبل آئل کے خالی ڈرم بھی بج رہے تھے۔ میں نے اپنے اندر زور زور سے گانا گانے کی خواہش محسوس کی۔ تانگے والے سے کہا۔

"پھرایا!"

"جی!"

"پھرایا!!"

"جی حضور فرمائیے"

"اونچا کیوں نہیں بولتا"؟

"فرمائیے نا حضور!"

"تو گانا گا سکتا ہے؟"

وہ چپ ہوگیا۔

"بول! ـــ ماہیا سُنا!"

"میں نے کبھی گایا نہیں حضور!"

"پھر بھی کچھ نہ کچھ سُنا ـــ"

میں نے گھوڑے کی کمر پر ایک وار اور کیا۔ میرا ہاتھ روکنے کے لیے پھرایا کا ہاتھ ذرا سا اُٹھا لیکن پھرا اپنے آپ گر گیا۔

میں نے گھوڑے کی کمر پہ بے در پے پھر چابک برسائی اور گھوڑے کی تیز رفتار سے خوش ہو کر تانگے والے سے کہا۔"سُناتا کیوں نہیں۔؟"

وہ اپنے بے سُرے پن سے بھاری، بے ہنگم اور بے رس آواز میں گانے لگا۔

دروان دی ماری جندڑی علیل لے — سوہنا نہ تُندا دکھاں دی اپیل لے!

یکا یک میں نے تانگا روک لیا۔ گھوڑا پھر پھسل گیا۔ میں کود کر نیچے اُتر گیا پھر اِبا سے کہا۔ "گھوڑے کو اُٹھا میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ پگڑی کے ایک پلّو سے اپنے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ "جی اچھا!" سڑک کے کنارے شراب کی دُکان کھلی ہوئی تھی۔ دروازے کی درزوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

اپنے بید سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر کچھ کھُسر پھُسر ہوئی پھر آہستہ سے ذرا سا دروازہ کھول کر رحمت نے باہر جھانکا۔

"کیوں بے!" میں نے اس کے سر پہ بید مارا۔ "دکان کیوں کھول رکھی اس وقت؟"

"جی وہ ۔۔۔"

"جی وہ کا بچہ ۔۔۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔

اندر رحیم سے کا ایک دوکاندار اور میرا ایک ہیڈ کانسٹبل تھا جس نے اُٹھ کر مجھے سیلوٹ مارا۔ دین محمد سے میں نے کہا۔

"دین محمد دو بوتلیں لے کر باہر آجا!"

میں تانگے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑا ابھی تک گرا ہوا تھا۔ پھر ایا اس کی زین کھولنے میں لگا ہوا تھا۔ اور رو رو کر اُسے پچکار بھی رہا تھا ۔۔۔

"بیٹا! پُتر!! اُٹھ! خدا پر بھروسہ رکھ۔ شاباش شیر جوانا"!

دین محمد دو بوتلیں لے کر آگیا۔ تانگہ چھوڑ کر ہم پیدل چل پڑے۔ تھانہ

تھوڑی ہی دور تھا۔ بارش ہلکی ہوگئی تھی۔

"تو یہاں کب آیا تھا دین محمد۔۔۔!" میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے حضور۔!"

"یہ کپڑے والا کہاں سے مل گیا؟"

"چونگی سے کپڑا اچھا کرکے جارہا تھا" وہ ہنسکر بولا۔

"پھر؟ کچھ!"

"جی ہاں۔سب ٹھیک ہے۔"

"ہوں۔" میں نے ایک پتھر کو بوٹ کی ٹھوکر سے اڑایا۔" میرے گھر دو مرغ بھجوادیے تھے؟"

"جی حضور"

"وہ زخمی جو حوالات میں پڑا ہے اس کے وارث پہنچے؟"

"پہنچ گئے حضور۔"

"کوئی نئی واردات!"

"کوئی بھی نہیں حضور۔"

تھانے میں پہنچکر میں نے وردی اُتار کر کوارٹر سے تہمد اور کرتہ منگوالیا رات کا ایک بج رہا تھا۔سونے سے پہلے روزنامچے پر ایک نظر ڈال لینا مناسب سمجھا۔دین محمد اور چار سپاہی میرے پیچھے کھڑے ہوگئے۔

"کون کون حاضری دے گئے۔؟"

"فضلا، کریم، دوست محمد اور ہیرا۔" دین محمد نے بتایا۔

یہ سب ہسٹری شیٹر تھے۔ ڈاکے اور قتل اِن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کئی کئی سال کی سزا پانے کے بعد بھی باز نہیں آتے تھے۔

"اور سیدا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہ نہیں آیا۔ یار محمد کو بھیجا ہوا ہے پتہ لگانے۔"

"کتنی دیر ہوئی یار محمد کو گئے ہوئے؟" میں نے غرّا کر پوچھا۔

"کوئی دُو گھنٹے حضور۔"

"پھر ابھی تک نہیں لوٹا یار محمد؟ کسی دوسرے کو بھی بھیجا ہوتا پیچھے پیچھے!"

"جی ابھی بھیجتا ہوں۔ اکبر تم چلے جاؤ۔ سیدے کے گھر جانا سیدھے۔ گھر پہ نہ ملے تو اس کی عورت سے پوچھنا۔ ضرورت پڑے تو اُسے بھی تھانے تک لے آنا۔"

"بہت اچھا جناب!"

اکبر بغل میں لاٹھی اور ٹارچ لے کر باہر نکل گیا۔

میں وین محمد کو سیدے کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر کوارٹر میں سونے کے لیے چلا گیا۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ سیدے کا آج کی رات تھانے میں حاضری دینے کے لیے نہ پہنچنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ کئی برسوں سے اُس نے کوئی واردات نہیں کی تھی۔ جب سے اُس نے شرفو سے نکاح پڑھایا تھا۔ اُس کے بعد وہ جیسے بالکل بدل گیا تھا۔ وہ پہلا سا سیدا رہا ہی نہیں تھا۔ جس نے بارہا جیل کی دیوار پھاند کر خود کو رہا کرا لیا تھا، درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، پھڑکتی ہوئی مچھلیاں، کانوں کے پیچھے لمبے لمبے گھنگھریالے پٹے، سخت بانسے کی نوکدار ناک کے نیچے مڑی ہوئی مونچھیں، آنکھیں ایسی تیز اور

خوفناک کہ کمزور دِل تو صرف ایک جھلک دیکھ کر اپنا سب کچھ نکال کر آگے دھر دیں ریلوے مال گودام کی چھت توڑ کر کپڑا چرانے پر کئی بار دو دو تین تین سال کی سزا پائی تھی۔ آخری بار ایک ڈکیتی میں ران پر گولی کھائی تھی۔ جیل کے اسپتال میں پڑے پڑے بھاگ نکلنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ رات کو دریا پار کرتے ہوئے دوسری ران پر گولی کھائی اور پکڑا گیا۔ تین سال کے بعد جیل سے نکلا تو آتے ہی خان محمد کی عورت کو دل دے بیٹھا۔ کتنا عرصہ خان محمد کے پیچھے اس بات کے لیے پڑا رہا کہ وہ اپنی عورت کو طلاق دیدے۔ جب وہ نہیں مانا تو ایک دن شرفو کو اغوا کر لیا لوگوں کا کہنا صحیح تھا اگر شرفو کی مرضی نہ ہوتی وہ اُسے گھر سے زندہ باہر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اپنے علاقہ کی وہ واحد مغرور حسین عورت تھی۔ سرو قد سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی شوخ اور سیاہ آنکھیں، گھٹنوں تک پہنچنے والے سیاہ ریشمی بال جن کی وہ کئی کئی مینڈھیاں بنا کر سر کا تاج سجاتی تھی۔ چاندی کی پازیبیں پہن کر چھن چھن کرتی ہوئی کسی راستے سے نکل جاتی تو دیکھنے والے دل تھام کر رہ جاتے شعرا دوہے کہتے۔ ماہیا اور ڈھولا الاپتے۔ اس کی خاطر لوگ شاعر بھی بنے اور سودائی بھی۔ اس کی خاطر دوستوں اور یاروں میں کتنی دشمنیاں پڑیں۔ رقابت نے دو قتل بھی کرائے۔ باپ کچہری کا معمولی کارندہ تھا۔ چاہتا تو اُسے کسی بڑے سے بڑے افسر سے بیاہ کر اپنی غریبی اور ذلت کے زنجیر کاٹ سکتا تھا۔ لیکن غیرت نے گوارا نہ کیا کہ بعد میں کسی سے دو بول سنتا۔ ایک دن چپکے سے بیٹی کا خان محمد سے نکاح پڑھا دیا۔ خان محمد بھی اپنے ماموں کی باتوں میں آگیا تھا ورنہ اُس نے اس حسین آفت کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بالآخر شرفو سیدے کے ہاتھ

لگی۔ اس نے اس کی خاطر مقدمہ لڑا۔ خان محمد کے آگے ناک رگڑی۔ اور جب اسے حاصل کرلیا پھر بالکل سدھایا ہوا گھوڑا بن گیا۔ ڈاکہ زنی سے توبہ کرلی۔ صبح سے شام تک منڈی میں کمر پر اناج کی بوریاں ڈھوتا۔ جو ڈھائی روپے مل جاتے لے کر گھر آجاتا۔ دو لڑکیاں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔ اب اُس سے ڈاکے کی قطعی اُمید نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن وہ کافی عرصہ سے اس طرح رات کو غائب بھی تو نہیں ہوا تھا۔ ایسی سخت اندھیری اور بادلوں سے گھری ہوئی راتیں ڈاکے اور نقب زنی کے لیے بہت موزوں ہوتی ہیں۔

میں کتنی دیر تک چارپائی پر پڑا پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ میرا خدشہ غلط نہیں تھا میں اُٹھ کر تھانے میں جانے والا ہی تھا کہ دین محمد کی آواز سُنائی دی اور اس نے بتایا کہ اکبر اور یار محمد دو نو سیدے کو ڈھونڈنے میں ناکام رہے تھے۔ مجبور ہو کر اسکی عورت کو تھانے میں لے آئے تھے۔

میں کرتے کے بٹن بند کرتا ہوا تھانے میں آ بیٹھا۔ اور سب سپاہیوں کو بلا کر شہر کے کونے کونے میں بھجوا دیا۔ کہہ دیا لوگوں کو جگا کر خبردار کردیں۔ اور سیدا جہاں بھی مل جائے اُسے گھسیٹ کر یہاں تک لائیں۔

شرفو نے یہ حکم سُنا تو چیخ کر بولی ـــ "ایسا ظلم نہ کرو سرکار! خدا تمہارا رزق قائم رکھے حاکم! وہ اب ایسا کام نہیں کرسکتا۔ میں رسول کی قسم کھا کر کہتی ہوں"

"چپ!" گالی میرے لبوں تک آ کر رُک گئی۔ میں نے دیکھا۔ شرفو اب چار سال پہلے کی حسین وجمیل قاتل نہیں رہی تھی۔ اس کا چہرہ سوکھ گیا تھا۔ بالوں کی خوبصورتی فنا ہو چکی تھی۔ جسم کے ساتھ دونوں بچیوں کو چپکائے اپنے خاوند کے لیے رحم کی

بھیک مانگ رہی تھی۔ میں نے اُسے ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جانے کے لیے کہا اور حقہ گڑگڑانے لگا جو دین محمدؔ نے بھر کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔

جوں جوں سیّدے کی کھوج لگنے میں دیر ہو رہی تھی میرا غصّہ بڑھتا جا رہا تھا۔ صبح پانچ بجے جب ہر طرف روشنی پھیل گئی تو یار محمد اور اکبر سیّدے کو ساتھ لے کر تھانے میں حاضر ہو گئے۔ سیّدے کے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں کپڑے کی گیلی پوٹلی تھی۔ اُسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ گالیوں کی ایک لمبی بوچھاڑ کے بعد دین محمد سے کہا اُسے زمین پر لٹا کر جوتے مار مار کر ادھ موا کر دے

دین محمد نے ایسا ہی کیا۔ سیّدا خدا کا واسطہ دے دے کر کہتا رہا۔

"میری بات سُن لو سرکار! میں نے چوری نہیں کی ہے۔ قسم خدا کی! میری ایک بات سُن لو حاکم!" ساتھ ساتھ شرفو اور اس کی بچیوں کی چیخیں بھی سنائی دیتی رہیں۔

جب اُسے میرے سپاہی مارتے مارتے تھک گئے۔ اور سیّدے کا سارا جسم جگہ جگہ سے اُدھڑ کر سوج گیا اور خون بہنے لگا تو میں نے اس کی پٹائی رکوا دی اور پھر بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"اب بتا کہاں تھا رات بھر! اور دیکھ جھوٹ مت بولنا ورنہ دوسرے سپاہی بلا کر پھر ایک گھنٹے تک ایسی مار کھلاؤں گا۔"

وہ سر جھکا کر سسکتے ہوئے لمبے لمبے بالوں سے کیچڑ اور مٹی پونچھنے لگا۔ اس کا چہرہ مار کھا کر بہت خوفناک ہو گیا تھا۔ بیوی بچوں کی موجودگی نے اُسے آبدیدہ کر دیا۔ جھکی جھکی مونچھوں کے نیچے بڑبڑایا: "آپ نے بڑا ظلم کیا ہے سرکار! خدا گواہ ہے! خدا سب دیکھ رہا ہے۔ آپ نے بہت ظلم کیا ہے۔"

"اب کچھ منہ سے بکے گا یا پھر مار کھائے گا؟" دین محمد نے اُسے پیر سے چھو کر کہا۔

"میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ اب بھی کہتا ہوں میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا۔ قسم لے لو۔ بڑی سے بڑی"

"رات کو گھر سے کہاں غائب ہو گیا تھا؟ بتاتا کیوں نہیں؟"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آہستہ سے لنگڑاتا ہوا اُٹھا۔ ایک طرف پڑی ہوئی لاٹھی اور پوٹلی اُٹھا کر بولا ــــ "حضور یہ سچ ہے ایسی اندھیری راتوں میں میں نے کتنے ڈاکے مارے ہیں کتنی بار نقب زنی کی ہے۔ کل رات جب میں سو رہا تھا۔ جب زور زور سے بادل گڑگڑائے اور بارش ہونے کے آثار دکھائی دیے تو میرے ہاتھوں میں بڑی کھجلی ہونے لگی۔ بڑے زور کی کھجلی۔ میں خود پر قابو نہیں پا سکا۔ لاٹھی اور آٹا لے کر چپکے سے باہر نکل گیا۔ رات بھر دریا کے کنارے بیٹھا مچھلیاں پکڑتا رہا۔ یقین نہ آئے تو دیکھ لیجیے"

یہ کہہ کر اُس نے پوٹلی کھول دی۔ چھوٹی چھوٹی کئی مچھلیاں نیچے زمین پر گر پڑیں۔

نصیب جلی

سنہ ۱۹۵۹ء

دروازے کے باہر سائیکل کی گھنٹی سنتے ہی موتا سنگھ کے بچے ——
دروازہ کھولنے کے لیے دوڑ پڑے۔ تینوں بچوں نے ایک ساتھ کنڈی پر ہاتھ رکھا
دروازہ کھول کر تینوں ایک ساتھ چلائے

"ڈارجی آ گئے، ڈارجی آ گئے!"

اور پھر تینوں ایک ساتھ ہی اچانک موتا سنگھ کی سائیکل پر سوار ہو گئے۔ ایک آگے بار پر۔ دوسرا گدی پر اور تیسرا پیچھے کیریر کے اوپر۔ موتا سنگھ ہنستا ہوا اوجل ہوا بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ دھوپ میں سکھانے کے لیے رکھی ہوئی دال سمیٹ رہی تھی دھوپ صحن میں سے ہوتی ہوئی اوپر دیوار کی طرف جا پہنچی تھی۔

دھوپ روز اسی وقت برجی پر چلی جاتی تھی۔ موتا سنگھ بھی روز اسی وقت ورکشاپ سے گھر لوٹتا تھا۔ تیل کے بڑے بڑے دھبوں والی خاکی قمیص، نیکر اور میل سے سیاہ، چکٹ بوٹ پہنے ہوئے، اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی ہوتی سیاہ و سفید بالوں سے بھری بھری داڑھی مونچھ کے اندر سے اس کی مسکراہٹ جیسے چھن چھن کر باہر آتی اور دیکھنے اور ملنے والوں کو نہال کر دیتی۔

جس قدر وہ تندرست، توانا اور شوخ مزاج تھا اس کی بیوی اتنی ہی کمزور اور کم گو تھی۔ پانچ بچوں کو جنم دینے کے بعد اس کے جسم میں تن کر کھڑا ہونے

اور چلنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس کے خوبصورت قد اور اعضا کی دل کش مناسبت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی جوانی قیامت رہی ہوگی۔ ان تینوں بچوں کے علاوہ جو باپ کی سائیکل پر سوار تھے دو لڑکیاں بڑی تھیں۔ سب سے بڑی کا دو سال پہلے بیاہ ہو چکا تھا۔ اس سے چھوٹی دسویں میں پڑھتی تھی۔ وہ رسوئی میں میٹھی انگیٹھی پھونک رہی تھی۔ باپ کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئی اور بولی۔

"دارجی، آج ایک خط آیا ہے۔ پاکستان سے۔"

"پاکستان سے؟" موتا سنگھ نے حیرانی ظاہر کی۔ "کس کا خط ہے من جیت!"

من جیت کمرے کے اندر دیوار گیر پر سجا کر رکھے ہوئے گورو گرنتھ صاحب کے پیچھے سے ایک لفافہ نکال کر باہر لے آئی جس پر پاکستان گورنمنٹ کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ باپ کے ہاتھ میں دیتی ہوئی بولی۔

"پتہ نہیں کس کا ہے؟ اُردو میں ہے۔ میں تو اُردو جانتی نہیں!"

بچوں نے بے قابو ہو کر سائیکل کو گرا دینا چاہا۔ موتا سنگھ کے ہاتھ سے خط گر گیا اس نے جلدی سے سائیکل من جیت کے حوالے کی اور خط اٹھا کر صحن میں پڑی ہوئی ایک کھاٹ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ سے پگڑی اُتار کر گھٹنوں پر آگے رکھ لی دوسرے ہاتھ سے لفافے کے اندر جھانکا اور تہ کیا ہوا کاغذ کھینچا۔ ایک فلسکیپ کاغذ تھا۔ دونوں طرف لکھا ہوا۔

"اُترو اُترو، نہیں تو گرا دوں گی!" من جیت نے بھائیوں کو سائیکل پر سے اُتار کر سائیکل برآمدے میں کھڑی کر دی۔ بچے پھر باپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک پیچھے سے گردن میں باہیں ڈال کر جھولنے لگا۔ دوسرا ساتھ سٹ کر بیٹھ گیا۔ تیسرے نے ہاتھ سے

لفافہ لے کر حیرانی سے پوچھا۔

"یہ ٹکٹ کس قسم کا ہے دارجی؟"

"یہ پاکستان کا ہے بیٹے!"

"پاکستان کہاں ہے دارجی؟"

"اُدھر ہے پاکستان جدھر تیرے نانا رہتے ہیں ناں، ڈیرہ بابا نانک! وہاں سے بس تھوڑی دور رہ جاتا ہے۔ لا۔ اب مجھے دیدے لفافہ۔ ان سب کو باہر لے جا۔ من جیت! میں خط پڑھ لوں۔"

"پہلے یہ بتایئے یہ کس کا خط ہے؟"

"یہ — ؟ دیکھتا ہوں۔ یہ —" خط کے آخر میں وہ غلام سرور کا نام پڑھکر چونک گیا۔ "غلام سرور!" اُس کے منہ سے نکلا، اور اس کی نگاہ اپنی بیوی کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ بھی غلام سرور کا نام سُن کر چونک پڑی تھی۔ اور دال سمیٹتے سمیٹتے سر گھما کر دیکھنے لگی تھی۔

"کون غلام سرور؟" من جیت بھائیوں کو باپ کے پاس سے ہٹا کر وہاں خود بیٹھ گئی اور پوچھا۔ "ان کا پہلے کبھی آپ کو خط نہیں آیا؟"

"ہاں پہلے کبھی نہیں آیا!" موتا سنگھ جلدی جلدی خط پڑھنے لگا۔ وہ دو دو سطریں ایک ساتھ پڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غلام سرور نے اسے ایک عرصے کے بعد کیوں یاد کیا تھا۔ بارہ سال کے بعد پہلی بار اس نے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ پہلی بار اس کی خیریت دریافت کر رہا تھا وہ تو سمجھے ہوئے تھا غلام سرور زندہ نہیں بچا ہوگا۔ اگر بچ بھی گیا تھا تو آخر مسلمان تھا

اُسکی خیریت کیوں دریافت کرتا ــــ! وہ اس کا کون تھا؟ بس دو سال ہی کی تو دوستی تھی ان کے درمیان! جب وہ ایک ساتھ ورکشاپ میں فرّ بھرتی ہوئے تھے ایک ہی ورکشاپ میں انہیں جگہ ملی تھی۔ ایک ہی بیرک میں ایک دوسرے کے پڑوسی بنے تھے ــــ صرف دو سال کے لیے ــــ اور اب اس قلیل سی مدت پر بارہ برس کا بہت گہرا، بہت اونچا ملبہ پڑ چکا تھا۔ اس ملبے کے نیچے انکے کتنے مشترکہ قہقہے سانجھے مذاق اور بہت ساری یادیں دفن ہو کر ختم ہو چکی تھیں۔ وقت ایک گہرا، تیز و تند اور بار بار راستہ بدل لینے والا دریا بھی ہے جو اپنے طوفانی بہاؤ کے ساتھ صدیوں کی جمی ہوئی دھرتی کے بڑے بڑے چٹان سے ٹکڑے الگ کرکے کاٹ کاٹ کر بہا لے جاتا ہے اور پھر ذرّہ ذرّہ کرکے یہاں وہاں پھینک کر اس دھرتی کی ہستی ختم کر دیتا ہے۔ نام و نشان تک مٹا ڈالتا ہے۔ اس مٹی کی اپنی خوشبو نہیں رہتی۔ اپنا سنگیت مر جاتا ہے۔ کسی کو یاد نہیں رہتا۔ یہاں ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ وہاں ایک بہت بڑا میدان تھا۔ ادھر ایک پہونچے ہوئے فقیر کی قبر تھی۔ اس طرف ایک بہت بڑا مرگھٹ تھا۔ ایک عالیشان مویشی گاہ تھی جہاں میلوں دور دور سے دیہاتی آ کر یہاں ڈھور ڈنگروں کی خرید و فروخت کرتے تھے میلے میں جمع ہو کر ناچتے اور گاتے تھے۔ زیرِ آب پڑی ہوئی دھرتی کے سینے پر منوں ادرسٹّی آ آ کر پڑتی جاتی ہے۔

خط پڑھتے پڑھتے موتا سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غلام سرور نے اسے کبھی بھلایا نہیں تھا۔ اس کا پتہ کئی ذرائع سے دریافت کرتا رہا تھا۔ بیسیوں دوستوں سے پوچھا تھا کسی نے جواب دیا تھا تو پتہ نہیں بتا سکا تھا۔ کسی نے جواب ہی

نہیں دیا تھا۔ موتا سنگھ کئی سال ہوئے امرتسر کی ورکشاپ سے تبدیل ہوکر دہلی میں آ گیا تھا۔ کسی کو اس کا پتہ آسانی سے تھوڑی مل سکتا تھا۔ غلام سرور نے اس کے پتے کی کھوج اپنے ملک میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر کی مدد سے لگائی تھی۔ اور اسے وہ دن یاد ولا تھا جب فسادات کی مارکاٹ میں غلام سرور اپنی بیرک میں تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ رات کو وہ دیواریں اور چھتیں پھلانگتا ہوا موتا سنگھ کے گھر میں آ کودا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی دم میں اس کا خاتمہ ہو جانے والا تھا۔ اسے مارنے کے لیے اس کے کئی پڑوسی اس کی تلاش میں گھوم رہے تھے موتا سنگھ کے پاس وہ کسی اُمید پر نہیں آیا تھا۔ امیدیں تو ختم ہو چکی تھیں۔ آنکھوں کی مروّت رہی تھی نہ دلوں کی محبت۔ سرحد کے دونوں طرف ایک عجیب سی دیوانگی اور وحشت کا دور دورہ تھا۔ برہنہ تلواریں، نیزے، گنڈاسے چاروں طرف مصروف رقص تھے۔ بجلی کی سی چمک کے ساتھ کوندتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں سر تن سے جدا کر دیتے تھے۔ وہ موتا سنگھ سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ موتا سنگھ بھی اسے قتل کر سکتا تھا۔ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے قتل اور اغوا کا انتقام اس کی بوٹی بوٹی الگ کر کے لے سکتا تھا!

جس وقت وہ دیوار پر سے لٹک کر دھم سے زمین پر گرا تو اسوقت موتا سنگھ اپنی روتی ہوئی چھوٹی بچی کو سینے کے ساتھ لگائے اُسے چُپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی سن جیت تھی وہ بچی۔ اس کی بیوی برآمدے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ صحن میں دھب کی آواز سُن کر دونوں چونک پڑے تھے۔ وہ

سمجھ سکتے شاید مسلسل بارشوں کی وجہ سے دیوار کا ایک حصہ گر گیا ہے۔ موتا سنگھ نے قریب جاکر دیکھا تو وہ غلام سرور تھا۔ زمین پر گھٹنوں کے بل گرا اُسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جو موت کی طرح خوفناک تھیں ——— نا اُمید تھیں ——— دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا۔ خاموش ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر رہے تھے۔ ایسی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ بس صرف زبان بند تھی۔ دل و دماغ پر بہت سے بوجھ پڑے ہوئے تھے۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی دونوں سمجھتے تھے۔ دونوں جانتے تھے۔ کچھ دیر تک موتا سنگھ خاموش کھڑا رہا۔ جب غلام سرور کی تلاش میں نکلا ہوا ہجوم دروازے پر پہونچ کر دستک دینے لگا تو غلام سرور نے ایک سسکی لے کر سر نہوڑا لیا۔ موتا سنگھ اسے بچانا بھی چاہتا تو اب یہ اس کے بس میں نہیں تھا، فسادی اس کا دروازہ توڑ کر اندر آجانا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا غلام سرور اسی کواڑ میں کودا تھا۔

اچانک موتا سنگھ نے اس کے سر کو چھوا۔ اس کا کندھا ہلایا۔ پھر ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے جانے لگا۔ اس میں اندر چلنے کی اب سکت کہاں تھی؟ گھٹنا زخمی ہو چکا تھا۔ اسے لڑکھڑاتا دیکھ کر موتا سنگھ کو غصہ آگیا۔ ماں کی ایک گالی دے کر اسے گھسیٹتا ہوا چارپائی کے پاس لے گیا اور اُس پر غلام سرور کو پٹخ کر بولا ———

"مر یہاں!"

جلدی سے ایک رضائی کمرے میں سے لاکر اُس کے اوپر ڈال دی۔ اُسی چارپائی پر اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ چلّائی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"تو بکواس بند کر نہیں تو کرپان سینے میں گھونپ دوں گا۔"

موتا سنگھ سچ مچ کرپان لیکر اس کے سر پر کھڑا ہوگیا تھا۔ بچّی کو نیچے فرش پر گرا دیا تھا جو زار و قطار بلبلا رہی تھی۔

"دونوں لیٹے رہو سیدھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل لگ کر کسی کو شک نہ ہو کہ دو سوئے ہوئے ہیں۔"

یہ سُن کر غلام سرور اور موتا سنگھ کی بیوی کی رگوں کا خون منجمد ہو کر رہ گیا دونوں کے جسم بالکل سُن ہو کر رہ گئے، بے حس و حرکت، رضائی کے باہر صرف موتا سنگھ کی بیوی کا چہرہ تھا ـــــ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرف دیکھ رہی تھی۔ سمجھ رہی تھی۔ پاگل ہوگیا ہے ـــ!،

اُسی وقت بہت سے لوگ دیوار پھاند کر اندر آگئے تھے۔ دروازہ کھول کر اُنہوں نے اور بھی بہت سے لوگوں کو اندر بلا لیا تھا۔ صحن میں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہی تھی۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ ہر شخص غلام سرور کی جان لینا چاہتا تھا لیکن غلام سرور وہاں کہاں تھا۔ انہوں نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ پھر حیران اور مایوس ہو کر وہاں سے چلے گئے تھے۔

غلام سرور نے لکھا تھا۔

"مجھے آج بھی اُن لمحوں کی یاد آتی ہے تو میرا خون اُسی طرح رگوں کے اندر جمنے لگتا ہے۔ خدا کی قسم! تم نے وہ کام کیا تھا جو ایسے حالات میں میں نہ کرسکتا۔ کبھی نہ کرسکتا۔ میرا سر تم دونوں کے آگے ہمیشہ تا زندگی جھکا رہے گا۔ میں اجمیر شریف میں چشتی والے خواجہ کے عرس میں شریک ہونے کے لیے آرہا ہوں۔ اِس مہینے کی پندرہ تاریخ کو فرنٹیر میل سے دہلی پہونچوں گا۔ ایک دن قیام تمہارے گھر پر کروں گا۔ تم مجھے اسٹیشن پر ضرور ملنا۔ خدا جانتا ہے تم سے کہنے کے لیے میرے دل میں اَن گنت باتیں ہیں۔ ملوگے تو سب کہہ سُناؤں گا اب تو تمہاری دونوں لڑکیاں سیانی ہوگئی ہوں گی شاید شادی بھی کرچکے ہوگے اُن کی۔ اور بھی بال بچے ہوں گے تمہارے۔ اِن سب سے میرا الگ الگ پیار کہنا۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض۔ میرے بھی چار بچے ہیں، خیر سے بڑے بڑے ہیں پڑھتے ہیں۔ ملنے پر سب کی کیفیت سُناؤں گا۔ ملنا ضرور۔ ورنہ تمہارا گھر ڈھونڈھنے میں مجھے بہت

وقت ہو گی۔

تمہارا۔ غلام سرور

مستری (فرم) گریڈ اول مشین شاپ لوکو مغل پورہ

این ڈبلیو آر۔ مغربی پاکستان

خط ختم ہو چکا تھا۔ خط کو تہہ کر کے وہ لفافے میں رکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری فکر پیدا ہو چلی تھی۔ اور ایک قسم کی سختی بھی، جیسے اس کے چہرے کی ڈھیلی ڈھالی جلد اچانک تن گئی ہو۔

اُس کی بیوی دونوں ہاتھوں میں ایک چھاج میں دال بٹور کر لاتی ہوئی اُس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ شلوار، قمیص اور دوپٹہ میں دُبلا پتلا جسم، ہلکے ہلکے سیاہ بال جو اپنی چمک کھو کر اب مرجھائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر زردی سی کھنڈی ہوئی تھی اُس کے۔ بولی —

"یہ وہی غلام سرور ہے جو امرتسر میں ہماری بارک میں رہتا تھا؟"

موتا سنگھ نے بیوی کو گھورا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف اُبھر آیا پھر اس خوف پر درشتی اور نفرت چھا گئی۔ اس نے جواب دیا۔

"ہاں"!

"کیا لکھا ہے اُس نے؟" اُس کی بیوی نے پھر پوچھا۔

"وہ اجمیر کے عرس میں آ رہا ہے۔ کہتا ہے تمہارے گھر بھی آؤں گا ملنے کے لیے۔ لیکن میں اُسے یہاں نہیں لاؤنگا"!

"کیوں؟" — یکایک اس کی بیوی نے چھاج پھینک دی۔ دوپٹے کو مروڑ کر دونوں ہاتھوں کے گرد اس طرح سختی سے لپیٹنے لگی، جیسے کسی کی

گردن مروڑ رہی ہو۔ کڑک کر پوچھا ــــ

"بولو اُسے یہاں کیوں نہیں لاؤ گے ؟"

"ماں ماں، تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟" من جیت گھبرا کے پرے ہٹ گئی موتا سنگھ بھی گھبرا کر چارپائی سے کھڑا ہو گیا، جیسے وہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی تھی ! بولا۔

"من جیت کی ماں ! میں اُس سے ملوں گا بھی نہیں۔ اس کے سامنے جاتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے !"

"شرم سی محسوس ہوتی ہے ؟؟"

بپھر کر اُس نے خاوند کا گریبان پکڑ لیا ــــ

"تمہیں شرم محسوس ہوتی ہے ؟ آج شرم محسوس ہوتی ہے۔ جب میں بوڑھی ہو گئی ہوں ! ــــ بارہ برس پہلے شرم نہیں محسوس ہوئی تھی جب میں جوان تھی ــــ ! تب تو تم نے میری چھاتی پر کرپان رکھ کر مجھے خاموش کرا دیا تھا میں اپنی چھاتی کے اندر پڑے ہوئے اتنے بڑے بھٹ کو آج تک نہیں بھول سکی۔ تمہیں بھی وہ بھٹ نظر نہیں آیا کبھی ! کیسے نظر آ سکتا تھا ــــ یہ نصیب جلی میں ہی ہوں جو آج تک چپکے چپکے رو رو کر سسک سسک کر اس گھاؤ کی پرورش کرتی رہی ہوں۔ میں اُسی دن مر جاتی، اسی وقت جان دیدیتی ــــ لیکن تم نے مرنے نہیں دیا۔ تم نے مجھے روکے رکھا تھا۔ تم نے مجھے دلاسہ دیا تھا، تم نے مجھے یقین دلایا تھا۔ اس بات کو کبھی یاد نہیں کرو گے۔ کبھی نفرت نہیں کرو گے۔ کبھی طعنہ نہیں دو گے ــــ آج تمہیں اُس سے

ملتے ہوئے شرم کیوں آرہی ہے ؟ — تمہیں یہ سوچ اسوقت کیوں نہیں آئی — ! ؟ میری بھی کوئی شرم ہے ! میری بھی کوئی عزّت ہے !! — میرا زخم آج پھر پھٹ گیا ہے ——— میری عزّت مٹی میں آج پھر ملی ہے ———!!! "

یہ کہتے کہتے وہ زار زار روتی ہوئی سینہ کوبی کرنے لگی ——— اور دھم سے بیٹھ کر اپنا سر فرش کے ساتھ ٹکرانے لگی ۔

ابرِ محیط

۱۹۵۹ء

جب لالہ بھیم چند کا انتقال ہوا۔ اُس وقت اُس کی عمر ساٹھ سال تھی۔ لیکن اُس کے فوت ہوتے ہی نہ صرف اُس کے خاندان بلکہ پورے شہر میں ایسا کہرام مچا کہ دیکھنے اور سننے والے سمجھے، کوئی جوان مرا ہے!

ریٹائر ہونے کے بعد اُسے تھوڑے دن پہلے دوسری ایکسٹینشن ملی تھی صحت بھی تو ایسی کوئی بُری تو نہیں تھی، اونچا توانا اور بھرے ہوئے جسم کا مالک تھا، کلین شیو چہرہ، چوڑے رخساروں کے درمیان اونچی موٹی ناک، سخت جبڑہ، تیز اور روشن آنکھیں۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن ہمیشہ خضاب لگایا کرتا تھا، جہاں بیٹھتا رونقِ محفل بن جاتا۔ اپنے رسوخ سے سینکڑوں کو فیض پہنچایا تھا، کتنوں کو نوکری دلائی تھی۔ بے شمار ریفیوجیوں کو مکان اور کلیم دلائے تھے اُس کے در۔بار سے وہ بھی دعائیں دیتے ہوئے نکلے تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے دل میں کوئی بغض یا عناد رکھ کر وہاں گئے تھے۔ ایسے آدمی کے یکایک اُٹھ جانے پر کہرام نہ مچتا! یہ تو اُس کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے تھا،

پہلی بیوی کے وفات کے بعد پچاس برس کی عمر میں دوسری شادی کی تھی اس وقت اُس کی بیوہ کی عمر پچیس برس تھی۔ چار لڑکیاں بھی تھیں۔ سب سے بڑی آٹھ سال کی اور سب سے چھوٹی چھ ماہ کی۔ جس نے سُنا رو دیا۔ ٹھنڈی سانس

کھینچ کر تیمر دل بھگوان کی دُہائی دی۔ اور جانے کس کس نے نہ پوچھا:" اب اِن بچیوں کا کیا ہوگا ؟" کون جواب دیتا ؟ کون نہیں جانتا تھا کہ باپ کے نہ ہونے پر کم عمر لڑکیاں کیونکر پرورش پاتی ہیں۔ سنتوش جانتی تھی ایک دن یہ سوال اُس کے سامنے ضرور آئیگا۔ پہاڑ کی طرح اونچا ہو کر۔ اس کے چہرے پر یہ لکھا ہوا تھا کہ وہ اِس سوال کے مفہوم سے پہلے سے واقف تھی۔ لیکن وہ اُسے ٹالتی رہی تھی۔ کیا کرتی۔ ایک وقت میں وہ ایک ہی پہاڑ سے ٹکرا سکتی تھی۔ اپنے سے اونچے قد اور گھنے بالوں سے گھری ہوئی چھاتی والے پہاڑ کے ساتھ اُسے روز ہی سر پھوڑنا پڑتا تھا۔

کبھی وہ دفتر کے کاموں سے سخت تھک کا کر لوٹتا تو اُسے راحت پہنچانے کے لیے اس کی چٹان سی سخت چھاتی پر سر رکھ کر لیٹنا پڑتا۔ وہ دوستوں کی محفل سے برج کھیل کر ہنستا ہوا بہت اچھے موڈ میں بھی لوٹتا تب بھی اُسے اُس کی بغل میں گھس کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اور یہ خطرہ ہمیشہ سر پر لٹکتا رہتا کہ لڑکے کی بجائے لڑکی بھی ہو سکتی تھی اور اتفاق کی بات کہ لڑکیاں ہی پیدا ہوئیں۔ ایک آدھ لڑکا ہو بھی گیا ہوتا تب بھی آج مداحوں کے کہرام میں کوئی کمی محسوس نہ ہوتی۔ نہ ہی سنتوش کے سینے پر رنج و ملال کی ایک آدھی اینٹ کم ہونے کا احساس ہوتا۔ وہ پھر بھی بیوہ ہی کہلاتی۔

کھیم چند کی پہلی بیوی سے بھی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ شیاما اور شیلا کا چند سال قبل وہ بیاہ کر چکی تھی۔ شنکر سب سے بڑا تھا۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ امریکہ میں سرکاری خرچ پر انجینئرنگ کی تعلیم پا رہا تھا۔

لڑکیاں تار پاتے ہی آ پہنچیں۔ روتی بیٹھتی۔ باپ کے گُن کوئی اُن سے پوچھے اُنہوں نے باپ کی کون کون سی صفت رو رو کر بیان نہ کی۔ بڑی بوڑھیاں سُنتیں

تو سر ہلا ہلا کر کہتیں "باپ کی قدر بیٹیاں جانتی ہیں۔ صرف بیٹیاں۔" یہ سن کر وہ پھر رونے لگتیں۔ انہیں رلانا ہی مقصود ہوتا تھا۔ چھاتی پیٹ پیٹ کر، سر دھن دھن کر رو رو کر، چیخ چیخ کر جب تک عورت کے اندر آنسو کا ایک قطرہ بھی باقی ہے وہ روتی رہے گی۔ نہیں تو اندر سے کلیجہ پھٹ کر زخم ہو جائے گا۔ اتنا رو چکنے کے بعد بھی عورت کے آنسو نہیں تھمتے۔ اس کے زخم رستے ہی رہتے ہیں سنتوش بھی عورت تھی۔ وہ دن بھر سب عورتوں کے درمیان بیٹھ کر روئی تیسرے دن اندر جا پڑی۔ ماتم پرسی کو آنے والیاں بیٹیوں سے الگ ملتیں۔ بیوہ سے الگ۔ وہ دن بھر اندر پڑی پڑی شیرخوار بچی کو دودھ پلاتی رہتی اور وہیں سے نوکروں کو ضروری ہدایات بھی دیتی رہتی۔

لڑکیوں کے ساتھ ان کے خاوند بھی آئے تھے۔ سسر کی وفات پر کیسے نہ آتے پھر ابھی چند برس پہلے ہی ان کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد وہ یہاں آئے ہی کتنی بار تھے۔ بڑا شادی کے بعد اپنی سالی شیلا کی شادی پر آیا تھا۔ سری رام شادی کے بعد صرف ایک بار آیا تھا۔ دونوں کی عمر میں کوئی خاص فرق نہیں تھا ایک سینتالیس کا تھا۔ دوسرا چالیس کا۔ دونوں ادھیڑ۔ سنتوش نے یہ دیکھ کر انتہائی کوفت محسوس کی کہ اس گھر میں اسے سب بوڑھے ہی نظر آتے تھے۔ ان کی آواز کان میں پڑتے ہی وہ چڑ سی جاتی۔ جیسے کوئی سامنے آیا تو جوتا دے مارے گی منہ پر۔

ہارٹ کی بیماری سے آناً فاناً مر جانا بظاہر بہت خوبصورت موت معلوم ہوتی ہے۔ نہ دوا نہ دارو۔ نہ اسپتال اور ڈاکٹروں کے جھمیلے۔ لیکن موت کے بعد کے دس پندرہ دن لواحقین کے لیے بے حد تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ دور نزدیک سے حسب توقع و خلاف توقع رشتہ دار چلے آتے ہیں۔ پورے گھر کا نظام بگڑ جاتا ہے

ٹھہرانے کا انتظام، کھلانے کا انتظام، ہر وقت رونا بین! لاکھ اختلافات ہوں، اُس وقت تو ہاں میں ہاں ملانے یا خاموشی کے کڑوے اور صبر آزما گھونٹ حلق سے نیچے اُتارنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ سنتوش کی گوشہ نشینی کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

AHMAD RESEARCH GHALIB INSTITUTE NEW DELHI-2

جس روز مرحوم کھیم چند کا دسواں تھا اُس دن دوپہر سے لے کر شام تک بے شمار غمگساروں کے آنے کی توقع تھی۔ دوپہر کو عورتوں کا جمگھٹ ہونا تھا شام کو مردوں کا۔ اس موقعہ پر پہنچنا شہر کا ہر شخص اپنا فرض انسانیت سمجھتا ہے - وہی فرض انسانیت جو اپنی موت کے خوف کا ایک نفسیاتی نتیجہ ہے۔

دوپہر میں جب سب عورتیں جمع ہوئیں تو مرحوم کی آخری رسوم سے پہلے سیاپا کرنے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ آگے پیچھے، بے ترتیب دائروں میں، ٹیڑھی میڑھی قطاروں میں۔ درمیان میں مرحوم کی نئی بیاہتا لڑکیاں تھیں - اس کی جوان بیوہ تھی۔ سب کے سر کھلے ہوئے میلے کچیلے کپڑے۔ رو رو کر سوجی ہوئی آنکھیں ہاتھوں سے پیٹ پیٹ کر زخمی کیے ہوئے رخسار! ابھی پھر پیٹنا تھا۔ باجماعت پیٹنا تھا۔ سنتوش کو ماتم کے اس طریقے سے سخت نفرت تھی - وہ آج تک کسی کے ہاں اس قسم کے ماتم میں حصّہ لینے کے لیے نہیں گئی تھی - وہ صرف منہ سے چند رسمی الفاظ کہہ دینا کافی سمجھتی تھی لیکن وہ کیا کرتی! جب اُس کے صحن میں اتنی ساری عورتیں جمع ہو گئی تھیں تو وہ خود سیاپہ کیسے نہ کرتی!

موت دیاں بھائیں لگیاں دے دھیّاں دا بیو
دُھکن لگے دُھوں —— دے دھیّاں دا بیو

جے میں آ ئی سامنے دے دھیاں داپیو

نیں مِٹھا سی توں دے دھیاں داپیو

ایک باقاعدہ کورس تھا۔ پریڈ کا سا منظر تھا لیکن اسے پریڈ کہنا بہت زیادتی ہوگی۔ کسی کے رنج والم کے ساتھ۔ پوری انسانی برادری کے ساتھ جو اِس قسم کے مظاہروں میں یقین رکھتی ہے۔ شیاما اور شیلا اپنی سُدھ بدھ بھول کرسینہ کوبی کر رہی تھیں۔ دھپ! دھپ!! دھپ!!! آنکھوں سے اشکوں کی ندیاں رواں تھیں۔ سر کے کھلے ہوے بال باربار آگے آپڑتے تھے۔ ڈوپٹے جانے کہاں گر گئے تھے۔ اس طرح منہ پر ہاتھ مار مار کر، چھاتیاں اور کولھے پیٹ پیٹ کر بہت سی عورتوں کو روتا دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے پورا عالم انسانیت خدا کے فیصلوں کے خلاف گریہ کناں ہو!

سنتوش ایسی اذیت ناک مشقت سے گھبرا کر اندر بھاگ گئی۔ پلنگ پر ہانپتی ہانپتی گر پڑی۔ کسی نے اُس کی روتی ہوئی دودھ پیتی بچی اِس کے پاس لٹا دی اس نے مشین کی طرح بلاؤز اٹھا کر ایک پستان لڑکی کے منہ میں دے دیا۔ لڑکی چپک چپک منہ مارنے لگی۔ وہ منہ پر بازو رکھے لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی۔ اُس کا سر گھوم رہا تھا۔ صحن میں عورتوں نے سیاپا بند کر کے ایک دوسرے سے گلے مل کر رونا شروع کر دیا تھا۔ ایک ہی سُر کے لمبے لمبے بین تھے۔ درد اور رنج میں ڈوبے ہوے۔

اچانک اُس کے کانوں میں کسی کی آواز آئی، کوئی اُس کے پاس کھڑا اُس سے کہہ رہا تھا ——— چچا جان کی موت کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ مجھے

پرسوں شام کو اطلاع ملی۔ میں گوالیار گیا ہوا تھا۔ میں کس قدر بدقسمت ہوں کہ اُن کے آخری درشن بھی نہ کر سکا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ اُن کے احسانات میں کبھی نہیں بھول سکتا!"

سنتوش نے آواز پہچان کر یک بیک آنکھیں کھول دیں۔ سامنے سریش کھڑا تھا۔ مرجھائی ہوئی صورت لیے۔ ماتھے پر بال بکھرے تھے۔ شیو بھی نہیں بنی ہوئی تھی۔ کپڑے کی پریس بھی بگڑی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ گاڑی سے اُتر کر سیدھا چلا آ رہا تھا۔ بچّی کے منہ سے پستان نکال کر بلاؤز ٹھیک کیا اپنے پاس جگہ دیکر بولی ——— "بیٹھ جاؤ۔"

سریش کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ گیارہ سال پہلے وہ ایک یتیم، بے یار و مددگار شرنارتھی لڑکے کی طرح کھیم چند کے دفتر میں نوکری کی تلاش میں پہنچا تھا۔ غالبًا وہ پہلا شرنارتھی تھا جس نے کھیم چند کو اپنی زبوں حالی اور دیانت داری سے متاثر کیا تھا۔ اور جب دفتر سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ محض ملازمت حاصل کر لینے کی خوشی سے ہی نہیں چمک رہا تھا بلکہ وہ کھیم چند کے خاندان کا ایک معزز رُکن بھی بن چکا تھا۔ کھیم چند کی پہلی بیوی کا انتقال چند ماہ پہلے ہوا تھا۔ اُسے گھر میں ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ جو بیٹا بیٹی نہ ہو۔ اگرچہ اولاد ہی کی مانند عزیز ہو۔ اُس کی مدد کر کے کھیم چند اپنی زندگی کے اُس خلا کو پُر کرنا چاہتا تھا۔ جو اُس کی بیوی کے انتقال کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ اُس گھر میں چار سال گزار کر وہ الگ جا کر رہنے لگا تھا۔ کھیم چند نے اُس کی ترقی کے لیے ایک ایسا پودا لگا دیا تھا جو اب پوری طرح کھل کر شاداب

ہو چکا تھا۔ اس گھر سے الگ جا کر رہنے کی حقیقی وجہ کھیم چند کی دوسری شادی تھی جس کی سریش نے مخالفت کی تھی۔ مخالفت تو شیاما شیلا اور ان کے بھائی شنکر نے بھی کی تھی۔ لیکن بند زبان سے۔ خاموش نظروں سے۔ یہ فرض سریش نے انجام دیا تھا۔

اچانک وہاں دو عورتیں شیلا کو اُٹھا کر اندر لے آئیں جو زور زور سے رو رہی تھی۔

"یہ تو اپنی جان دیدیگی رو رو کر۔"

شیلا کو دیکھ کر سریش چونک پڑا۔ اُٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ اُسے دیکھ کر شیلا بھی چونک پڑی۔ دوسرے ہی لمحہ میں چیخ مار کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور رونے لگی۔ سب اُن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سنتوش بھی گردن گھما گھما کر۔ سریش شیلا کی پیٹھ تھپک رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اور کہہ رہا تھا۔۔ "زیادہ مت روؤ۔ رونے سے کیا ہوگا؟ وہ تو جا چکے! انہیں تو جانا ہی تھا ایک دن!"

بڑی مشکل سے وہ شیلا کو اپنے سے الگ کر پایا۔ شیلا چارپائی پر اوندھی جا لیٹی۔ سریش رومال سے بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھتا ہوا پھر سنتوش کے پاس آبیٹھا پوچھا "کب آئی ہے؟"

"وہ آج ساتواں روز ہے۔" سنتوش کی نظر اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں پر تھی۔

"شیاما بھی آئی ہے؟"

"آئی ہے۔ باہر بیٹھی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد شیاما کو بھی باہر سے اندر لے آیا گیا۔ سریش کو دیکھ کر وہ بھی

اُس کے ساتھ روتی ہوئی لپٹ گئی۔ کتنی دیر تک وہ سب کے سامنے اسی حالت میں کھڑے رہے۔ سریش اُس کے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر خود بھی رو رہا تھا۔ اچانک فرش پر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ایک چھوٹا سا بچہ شیاما کی ٹانگوں کے ساتھ آ کر لپٹ گیا۔ اُسے سریش نے دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ اور آہستہ سے پوچھا۔

"یہی تمہارا بچہ ہے!"

شیاما نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنسو پونچھ کر سر جھکا لیا۔ سریش نے لپک کر بچے کو اُٹھا لیا۔ سینے کے ساتھ لگایا۔ چوما اور پھر اُسے لیے ہوئے سنتوش کے پاس آ بیٹھا۔ جو کتنی دیر سے اُس پر نظر جمائے ہوئے تھی اور یہ سوچ سوچ کر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی کہ سریش نے ابھی تک اُس کی کسی بچی کو نہیں پوچھا تھا۔ سامنے گھوم رہی تھیں۔ ہاتھ بڑھا کر کسی کو پچکارا نہیں تھا۔ شیاما کے بچے کو دیکھتے ہی سینے سے لگا لیا تھا۔ دروازے کے درمیان نوکر کو بیکار کھڑا ہوا دیکھ کر وہ اُس پر برس پڑی: "باہر جا کر دریاں کیوں نہیں جھاڑتا!" ابھی پھر مردوں کے آنے کا وقت ہو جائے گا!"

نوکر جیسے کان سمیٹ کر باہر کھسک گیا۔ سنتوش کی آواز میں غیر معمولی تیزی اور ترشی کا احساس قریب قریب ہر اُس شخص نے کیا جو کمرے کے اندر موجود تھا کسی نے کچھ نہ کہا۔ کچھ نے تو باہر کھسک جانے ہی میں بہتری سمجھی۔ سریش اس کے منہ لگا ہوا تھا۔ بول اُٹھا —— "کیا بات ہے؟ کہیں میری وجہ سے تو غریب کی جان نہیں لی جا رہی ہے؟"

یہ سُن کر سنتوش نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں غصّے اور

جھلاہٹ کی سُرخ ڈوریاں تھیں۔ بولی۔ نہیں،" گود میں لیٹی ہوئی بچی کو پلنگ پر لڑھکا دیا جو کتنی دیر سے اُس کی چھاتی چپ چپا رہی تھی۔ سریش اس کی جھلاہٹ کو گہری نظر سے دیکھتا رہا۔ سنتوش کی غصّہ بھری آنکھیں اب شیاما اور شیلا پر جمی ہوئی تھیں جو سریش کی موجودگی کی وجہ سے، معلوم ہوتا تھا باپ کی موت کا غم بھی بھول بیٹھی تھیں۔ بکھرے ہوے بال سمیٹ لیے تھے۔ چارپائی پر بیٹھی سریش کی طرف بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔

"کیسی ہو شیلا؟"

سریش کے سوال پر شیلا نے سر جھکا لیا۔

"شیاما، تمہیں! وہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

شیاما نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھر ڈبڈبا آئی تھیں یہ دیکھ کر سریش کی آنکھیں بھی نمناک ہوگئیں۔ اُس نے سر گھما کر پاس بیٹھی ہوئی سنتوش کی طرف دیکھا۔ سنتوش کی آنکھوں میں لمحہ بھر تک حیرانی کی پرچھائیاں نظر آئیں پھر یکایک ایک مجرمانہ ندامت ہویدا ہوگئی۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ تینوں کی نگاہیں سنتوش پر جمی تھیں۔ وہ شیلا اور شیاما کی قریب قریب ہم عمر تھی۔ لیکن اُس کے چہرے کی سنجیدگی، سختی اور درشتی بڑی بوڑھیوں کی سی تھی۔ اُس کے کالے چمکیلے بال جو اُس کے سر پر ایک تاج کی طرح سجتے تھے اُس وقت ایک پتلی سی چوٹی میں سمٹے ہوے تھے۔ اس کے بھرے بھرے رخساروں کے درمیان ابھری ہوئی پتلی اور سخت ناک جو اُس کے غرورِ حُسن کی بھی مظہر تھی۔ اب مرجھائی ہوئی اور شکست خوردہ نظر آتی تھی۔ وہ موٹی نہیں تھی

مگر بدن کو اُس نے کچھ اس طرح ڈھیلا چھوڑ رکھا تھا۔ اور کپڑے بھی کچھ اس قسم کے پہن رکھے تھے جس سے وہ بھرے ہوئے بدن کی نظر آ رہی تھی۔ پورے گھر کی باگ ڈور بھی جو اس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس کی خوبصورتی اور دلکشی پر اثر انداز ہوئی تھی۔ یکایک وہ بول اُٹھی "نہاؤ دھوؤ! باقی وقت ہی کتنا رہ گیا ہے!"

اُس کا رُخ مخاطب شیلا اور شیاما کی طرف تھا۔ اُسی وقت وہاں اُن کی پھوپھی آ گئی اُس نے بھی کہا — "جب تک غسل خانے کے دروازے پر نہیں رہو گی نہانے کی باری تھوڑی ملے گی! چلو"

کمرے میں سنتوش اور سریش اکیلے رہ گئے۔ شیاما کا بچہ سریش کے سینے سے لگا لگا سو گیا تھا۔ سریش نے اُسے پلنگ پر لٹا دیا۔ سنتوش کی بچی کے ساتھ۔ سنتوش نے دیکھا، سریش نے اب بھی اُس کی بچی کو پیار سے نہیں چھوا تھا۔ حسد سے اُس کے بدن کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ لیکن وہ سریش سے کیا کہے؟ وہ اس گھر میں گھر کے ایک فرد کی طرح رہتا رہا تھا۔ گھر کی ساری فضا اُس سے مانوس تھی۔ لیکن اُس نے سنتوش کی بچیوں کے تئیں ہمیشہ ایسا ہی سرد رویہ روا رکھا تھا۔

اُس وقت شیلا کا خاوند سری رام وہاں آ گیا۔ درمیانہ قد، بھرا بھرا بدن بالکل ہنسوڑ! دور سے بولتا آیا — "بھئی میں تمہیں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں۔ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ تم —"

سری رام ایک ایسا شخص تھا۔ جو غمی کے ماحول میں بھی قہقہہ لگانے کی آزادی

آسانی سے نہیں کھو سکتا تھا۔ سنتوش کو بہت سُست پڑا دیکھ کر سریش سے بولا۔

"اب پوری حکومت ہماری خوشدامن کے ہاتھ میں آ گئی ہے! میں خود کو بڑا خوش قسمت سمجھوں گا۔ اگر مجھے اُنہوں نے اپنا وزیر خارجہ چن لیا تو —!"

سریش نے کہا — "اس گھر کی چھت اب ہمیشہ تمہارے جیسے بڈھوں کے کاندھوں پر رہے گی۔ اِنہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اپنی لڑکیوں کے لیے ایسے داماد ڈھونڈھے تھے۔!"

یہ کہہ کر اُس نے طنز بھری نگاہوں سے سنتوش کی طرف دیکھا۔ سنتوش جیسے زخمی ہو کر پھڑپھڑا رہی تھی بس! کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

سری رام نے پوچھا — "تم نے مجھے بڈھا کہا!"

"تو اور کیا کہوں؟ چھٹے سر والا بچہ کہوں؟"

سری رام ہنس پڑا۔ بولا "تمہاری باتوں سے تو حسد کی بو آ رہی ہے! سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟"

یہ کہتا کہتا وہ سنتوش کی طرف پلٹ گیا۔ اُسی طرح ہنستا ہوا بولا —

"آپ بتائیے۔ میری شادی سے پہلے یہ لونڈا کہیں میری بیوی سے محبت تو نہیں کرتا تھا؟"

سنتوش اُس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ پھر منہ پھیر لیا۔ سریش کی طنز بھری نگاہیں اب بھی اُس پر پڑ رہی تھیں۔ سری رام کے ہنسنے کی آواز سُن کر پھوپھی

پھر اندر آگئی۔

"یہ کیا ہی ہی لگا رکھی ہے! گھر میں ماتم کی صف بچھی ہوئی ہے!"

"کوئی بات نہیں بوا! بڈھا ہی تو مرا ہے! اسکی بہوئیں ہوتیں تو آج شادی کے عروسی جوڑے پہن کر ناچی ہوتیں! کیا تم انہیں منع کرسکتی تھیں"!

پھوپھی بولیں: "لیکن جب کوئی اور نہیں ہنس رہا ہے تو تم اکیلے کیوں ہنستے پھرتے ہو"؟

"بات ہی کچھ ایسی تھی بوا کہ میں ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بات اگر کہیں شیاما کے میاں نے سنی ہوتی تو سچ کہتا ہوں اس وقت ایک اور ماتم کی صف بچھ گئی ہوتی! سنتے ہی ہارٹ فیل ہوگیا ہوتا بے چارے کا! وہ تو اسقدر وہمی ہے کہ شیاما کو گھر میں تالا لگا کر بند رکھتا ہے!"

"اچھا اچھا اب چلو باہر۔!"

پھوپھی اُسے باہر لے گئی۔ جاتے جاتے سریش سے کہہ گئی ـــ "اب تم بھی نہانے کی سوچو! کھانا تیار رہے"!

سریش کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے، کندھے اونچے کیے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا سنتوش نے اس کی طرف شکایت بھری نظروں سے تاکا۔ پھر آہستہ سے بولی۔ "تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ میں نے جان بوجھ کر ان کے لیے زیادہ عمر کے گھر والے ڈھونڈے ہیں؟"

سریش جاتے جاتے رُک گیا۔ اس کے پلنگ کے اور قریب ہو کر بولا ـــ "محض سمجھتا ہی نہیں مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا کر کے تم نے اپنی ناکام تمناؤں کا

انتقام لیا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ نشانہ کون بنا ہے؟ صرف وہ لوگ جو بہت معصوم تھے۔ تمہیں اِس گھر میں لانے کے لیے کسی طرح بھی ذمّہ دار نہیں تھے!"

"تم جھوٹ بکتے ہو! تمہارا خیال غلط ہے! مجھے محض پریشان کرنا چاہتے ہو، کیونکہ ــــ"

"کیونکہ ــــ کہو کہو! رُک کیوں گئی؟"

"کچھ نہیں۔ تم باہر چلے جاؤ۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ!"

یہ کہتے کہتے وہ اوندھی لیٹ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب سے اُس کا خاوند مرا تھا وہ اتنی شدّت سے نہیں روئی تھی۔ سریش چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔ جب اس کی بچّی نے اُس کے نیچے ہاتھ آجانے پر زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ تو اُس نے آگے بڑھ کر بچّی کو اُٹھا لیا۔ سنتوش سے کچھ نہ کہا۔ بچّی کو سینے سے لگا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔

راکھ

سنہ ۱۹۵۹ء

راگھو راج کی بات سُنکر ڈاکٹر سدیش جاوا کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ اُدھر اُدھر بہت بے چینی سے دیکھا اور پھر آگے میز پر پڑی ہوئی کسی انجکشن کی شیشی سے کھیلتی ہوئی بولی۔

"میں مسز خان کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اسکے پاس دن بھر اور کام ہی کون سا رہتا ہے۔ کبھی اُسکے گھر جا گھسی کبھی اِس کے پاس آ بیٹھی۔ اور اِدھر اُدھر کی لگا نا بجھانا تو اس کی بابی ہے اگر اس نے یہ کہا ہے کہ میں ایک بہت ہی معمولی گھرانے کی ہوں تو اسے اپنا اونچا خاندان مبارک ہو!"

راگھو راج نے اپنے ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی کو آہستہ آہستہ سہلایا جو اُس نے ابھی ابھی ڈاکٹر جاوا سے بندھوائی تھی اور کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ یہ نہ سمجھیئے میں مسز خان کو جانتا نہیں ہوں۔ اس تھوڑی سی مدّت میں میں نے اُسے خوب سمجھ لیا ہے اس نے تو میری بیوی کے دل میں بھی میرے خلاف اتنی غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ میری بجائے کوئی دوسرا شوہر ہوتا تو شاید بیوی سے لڑ جھگڑ کر کبھی کا الگ ہو چکا ہوتا۔ لیکن آپ تو جانتی ہیں ایسے معاملوں میں میں ذرا گہری سوجھ بوجھ رکھتا ہوں۔ میری بیوی مجھ سے پہلے سے زیادہ خوش ہے اور اب میری ہر بات کا خاص خیال رکھتی ہے۔"

ڈاکٹر جاوا بولی — "میرا خیال ہے کہ مسز خان کو میرے خلاف یوں کہنے جھکنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ میں نے اُسے پرسوں ایک بل بھیج دیا۔ وہ ہر روز تھوڑی تھوڑی گلیسرین منگوا لیتی تھی لیکن مجھے بھی تو بزنس کرنا ہے۔ یہ دواخانہ میں نے اپنا پیٹ پالنے کے لیے کھولا ہے۔"

راگھو راج نے ڈاکٹر کو گہری نظروں سے دیکھا اور وہ مسکرا کر بولا۔

"سُنا ہے اُسنے ایک بار خاوند کے ساتھ کسی بات پر لڑ کر چھت پر سے چھلانگ بھی لگا دی تھی۔"

اسی وقت دواخانے میں ایک حاملہ عورت آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی اندر آ گئی اس کے چہرے پر پیدل چل کر آنے سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ڈاکٹر کو اس کی طرف متوجہ پا کر راگھو راج وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

ڈاکٹر سدیش جاوا جب مریضہ کا معائنہ کر رہی تھیں اسوقت بھی اس کے چہرے پر ایک درشتی تھی۔ جو مسز خان کی باتوں کا ردِ عمل تھی۔ جب وہ فارغ ہو کر اپنی میز کے سامنے آ بیٹھی تو پھر ان باتوں کے متعلق سوچنے لگی۔

سانولے رنگ کے کسی قدر لمبے چہرے پر روشنی کے ساتھ ایک بے بسی بھی جھلکتی تھی۔ اسکے سر پر بہت کم بال تھے جتنے تھے وہ ایک چھوٹے سے جوڑے میں سمٹ جاتے تھے۔ کم بالوں کی وجہ سے اس کا چہرہ دلکشی سے بالکل خالی تھا۔ اسکے تپلے لمبے جسم میں کوئی دلکش قوس بھی نہیں تھی۔ وہ ایک بند رہنے والے پرانے چھاتے کی طرح تھی جسے اس کا مالک کبھی نہ کھولتا ہو۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس کی کمانیں کپڑے کو پھاڑ کر باہر نہ نکل جائیں۔ اس عورت کو غور سے دیکھنے کے بعد بھی یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ

اس کے اندر بھی کوئی خوبصورت عورت ہوگی۔ ہر شخص کے اندر ایک دوسرا شخص رہتا ہے جو اس سے زیادہ خوبصورت، زیادہ دلکش، زیادہ کومل یا زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہ اس کے اپنے تصورات، اپنی خواہشات اور اُمیدوں کا ایک ہیولیٰ ہوتا ہے جسے وہ اُٹھتے بیٹھتے، سوچتے، بولتے، لڑتے جھگڑتے۔ ہر وقت دیکھتا ہے۔ وہ کبھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ لیکن ڈاکٹر سدیش جاوا کے اندر سے کسی دوسری عورت کی جھلک نظر نہیں آتی تھی جیسے وہ عورت اس کی گرفت سے نکل چکی تھی۔ وہ یقین کے اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں سے وہ اپنے حقیقی وجود کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتی تھی!

رات کو نو بجے وہ دواخانہ بند کر کے گھر پہنچی تو اس کا آٹھ سال کا بچہ سو چکا تھا اس کا خاوند آرام کرسی پر لیٹا تاریخ کی کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ کچن کے اندر سے فرش دھونے کی آواز آرہی تھی۔

اس نے کوٹ اُتار کر دیوار پر لٹکا دیا۔ دوائیوں کا بیگ میز پر سے اُٹھا کر پاس پڑے ہوئے ایک اسٹول پر رکھ دیا اور ایک تازہ آیا ہوا خط دیکھ کر بولی۔

"یہ خط آج آیا ہے؟"

"ہاں" اسکے خاوند نے اس کی طرف بغیر دیکھے جواب دیا۔

"بابا کا ہے نا؟"

"ہاں!"

"کیا لکھا ہے؟"

"پڑھ لو!"

سدیش نے خط پڑھنے کے بعد کہا۔
"آپ کے پاپا دو سال گذر جانے پر بھی مجھے سخت سُست لفظوں سے یاد کرنا نہیں بھولتے!
اس کے خاوند نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس کی بیوی نے مزید کوئی بات کی تو وہ غصے سے کتاب پٹخ دیگا۔ سدیش ہاتھ دھوکر کمرے میں لوٹی تو بوڑھی ملازمہ نے میز پر اس کے لیے کھانا لگا دیا تھا۔ اس کے خاوند سے تھوڑی دور۔ وہ خاوند کے ساتھ کوئی بات کیے بغیر چپ چاپ کھانے لگی۔ کمرے کی خاموش فضا میں کبھی کبھی پلیٹ اور چمچ کے ٹکرانے کی آواز پیدا ہو جاتی تھی۔
کھانے سے فارغ ہو کر وہ آرام کرسی پر جا لیٹی تو اس کے خاوند نے اپنی کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا — "میں کل جاؤں گا!"
"جائیے۔ میں آپ کو روک تھوڑی سکتی ہوں!!" سدیش کے چہرے پر ایک درشتی اُبھر آئی۔
"ٹیٹو کے برتھ ڈے پر بھی ہم نہ پہنچے۔ تو وہ سخت ناراض ہوں گے!"
"پہلے تو وہ ہم پر بہت خوش ہیں جیسے!"
کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ پھر سدیش جیسے اپنے آپ سے بولی۔
"ہمارے گگو کے کسی جنم دن پر آنے کی وہ تکلیف نہیں کر سکے۔ شاید اس خیال سے کہ ہم چونکہ ناراض نہیں ہوتے! اگر ناراض بھی ہوتے ہیں تو ان کی جوتی سے! ہماری ناراضی ان کے نزدیک کیا وزن رکھتی ہے!"
اُس کے خاوند نے تاریخ کی کتاب میز پر پٹخ دی۔ کہا۔
"ہسٹری میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد بھی مجھے کہیں نوکری نہیں ملی۔ وہ ٹیوشن

پڑھانے سے کتنے روپے مل جاتے ہیں! میں دیکھ رہا ہوں میرا ایجوکیشن کا کیریر تو خراب ہو ہی چکا ہے اب کیوں نہ پبلشنگ کا کام شروع کر دوں۔ ممکن ہے بابا کا دل کچھ نرم ہو اور مجھے دس پندرہ ہزار روپے دے سکیں۔"

"ایک ذرا محنت کی ہوتی تو ایم۔ اے میں تھرڈ کلاس آنے سے بچ جاتے۔ یاد ہے اس وقت قاضی صاحب نے اپنے کالج میں آپ کے لیے جگہ ریزرو کر رکھی تھی۔"

"سدیش، میرا منہ مت کھلواؤ اب!"

"کیا مطلب؟"

"جیسے جانتی ہی نہیں ہو کہ کون اسکے لیے ذمہ دار ہے!"

"آپ کا مطلب ہے میں ذمہ دار ہوں"؟

"جب جانتی ہو تو مجھ سے کیوں کہلواتی ہو!"

"یہ بات میں برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ رو پڑی۔ "آپ نے پہلے بھی دو ایک بار یہی بات کہی ہے۔ اُس دن کرنل سنگھ سے بھی کہا تھا۔ آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے جھوٹے الزام کی۔ جب آپ کا امتحان سر پر تھا تو اس وقت آپ کو میرے کون سے نخرے اُٹھانے پڑتے تھے؟"

"میں تمہارے گھریلو جھگڑوں سے پریشان رہتا تھا۔"

"جیسے تمام جھگڑے میرے ہی پیدا کیے ہوئے تھے، آپ کے بابا کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

"بابا کا کتنا بڑا قصور کیوں نہ ہو لیکن تمہیں اس میں دلچسپی لینے کی کیا ضرورت تھی! تم کیوں ہر وقت کڑھتی تھیں! کیوں بار بار اُن کا ذکر لے بیٹھتی تھیں۔"

پونے چھ فٹ لمبا چھریرے بدن کا اٹھائیس برس کا مرد جیسے اب فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ گھر کے پرانے جھگڑوں سے مکمل طور پر ریٹائر ہو جائے گا۔ چند برس پہلے وہ بیوی کی جو ہر بات مان لیتا تھا اُسے اب جھٹلائے گا۔ لاشعوری طور پر اپنی ناکامیوں کا سارا انتقام اپنی عورت سے لے گا جو اب عورت نہیں رہی تھی۔ اپنی جاذبیت اور خوبصورتی کا سارا خزانہ لٹا کر محض ایک جلی ہوئی لکڑی رہ گئی تھی۔ جس سے تنور کی آگ اور راکھ پر دلنے کا کام لیا جاتا ہے۔ خاوند کی باتیں سُن کر سدیش روتی رہی۔ منہ کو ہاتھوں سے ڈھک کر سسکتی رہی۔ اِس کے بعد وہ کچھ نہ بولی۔ ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ اگرچہ وہ خاوند کو اس بات کا احساس دلانا چاہتی تھی کہ اُن کے اِس گھر سے نکل آنے ہی میں بہتری تھی۔ جب سے وہ ماں باپ کے گھر سے نکل کر یہاں آ گئے تھے تب سے وہ برابر اپنے خاوند کو اس بات کا احساس کرا رہی تھی لیکن ابھی تک اس کے دل و دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھی تھی۔ ابھی تک وہ یہی سمجھتا تھا گھریلو جھگڑوں کی واحد ذمہ دار سدیش تھی۔ اس کے پاپا بھی یہی کہتے تھے اور وہ غلط نہیں کہتے تھے۔ شادی سے پہلے سدیش کے باپ نے اپنے داماد کو مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن شادی کے بعد وہ اپنے وعدے سے مکر گیا تھا۔ اس کے پاپا اس بات کو آج تک نہیں بھولے تھے۔ سدیش کو یہ بات شادی کے بعد معلوم ہوئی۔ اُس نے اپنے باپ سے بھی پوچھا تھا وہ اپنے حالات کا رونا رو کر چپ ہو جاتے تھے۔ سدیش نے اپنے خاوند سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے انگلینڈ بھجوائے گی۔ دواخانے سے جتنی آمدنی ہو گی وہ اس کی تعلیم پر صرف ہو گی لیکن اس آمدنی سے بمشکل گھر کا خرچ چل رہا تھا ایک دو ٹیوشن جو اس کا خاوند پڑھاتا تھا ان سے وہ اپنی کتابیں خرید لیتا تھا۔

اچانک کال بیل بجی۔ ایک دو لمحے بجتی رہی۔ نہ سدیش اپنی جگہ سے اُٹھی نہ اس کا خاوند۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ضرور کوئی مریض ہوگا۔ کوئی بلانے آیا ہوگا۔ بارہا ایسا ہوا تھا کہ سدیش اپنے خاوند کی خواہشات کا خون کر کے بھی چلی گئی تھی۔ اسوقت اسے سخت غصہ آیا کرتا تھا کہ اس نے اپنے لیے ایک ڈاکٹر ہی کیوں منتخب کی تھی لیکن آج — اب وہ چاہتا تھا کہ سدیش کال بیل کی پہلی گونج پر اٹھ کر باہر چلی جائے۔ وہ کیوں بیٹھی ہے؟ جاتی کیوں نہیں؟

وہ خود باہر گیا اور اپنے ساتھ اپنے پڑوسی خان کو لے آیا۔

"خان صاحب آئے ہیں۔"

اسنے آنکھیں پونچھ کر دیکھا۔

"آداب عرض۔"

دبلا کمزور، لڑکھڑاتا ہوا جسم! جس پہ گرم اوورکوٹ اور پھٹے اور سر پہ قراقلی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔

"عائشہ کو پھر غش آگیا ہے!"

وہ مسز خان کا منہ اب نہیں دیکھنا چاہتی تھی اُسے سب کچھ یاد آگیا۔ دن میں وہ اسکے دواخانے میں آتی تو وہ اس کا منہ نوچ لیتی کھڑے کھڑے باہر نکلوا دیتی لیکن اب، کیا اُسے جانا ہوگا۔ اُن کے ہاں سدیش اور اسکے خاوند نے کئی بار چائے پی تھی۔ اس کالونی کے لوگ بہت زیادہ نیاض تھے۔ ایک دوسرے سے تعلقات بڑھانے کے لیے اکثر ایک دوسرے کو دعوت پر بلایا کرتے تھے۔ اس طرح آزادی سے ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں اگرچہ کسی کے نزدیک کوئی خرابی نہ

پیدا ہوتی ہوگی لیکن سدیش جاوا نے مسز خان کے ساتھ تعلقات توڑ لینے ہی میں بہتری سمجھی۔ اگر اس کے دواخانے کا سوال سامنے نہ ہوتا تو وہ اپنے خاوند کو مجبور کرتی کہ وہ کسی دوسری کالونی میں جا بسیں۔ لیکن انہیں یہیں رہنا پڑا۔ مسز خان کے ساتھ اب اس کے تعلقات محض ڈاکٹر اور مریضہ کے تعلقات تھے۔ وہ اُسے مفت ایک پیسے کی دوا بھی دینا گوارا نہیں کرتی تھی۔ مسز خان اپنے طور پر چاہے کچھ کہا کرے سدیش اس کی کیوں پروا کرتی۔!

ڈاکٹر سدیش جاوا نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا جو اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو —— جاتی کیوں نہیں ہو"؟

اس نے اپنا بیگ سنبھالا جسے خان نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دونوں باہر چلے آئے۔

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کالونی کی نئی سڑک پر پتھر ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے انہیں ابھی کوٹا جائے گا۔ ان پر تارکول پھیلایا جائے گا۔ اور پھر انجن چلے گا۔ کئی دن تک یہی ہوتا رہے گا۔ ایک چکنے پتھر پر سدیش کا پاؤں پھسلا لیکن وہ سنبھل گئی۔ خان گھبرا کر کچھ کہنے والا تھا لیکن خاموش رہا۔ سدیش نے کوٹ کے کالر اٹھا کر ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے اپنے کان بچانے کی کوشش کی۔

مسز خان اپنے پلنگ پر مٹھیاں بھینچے اور دانتوں کا جبڑا کسے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ترشے ہوئے خوبصورت بال تکیے پر بکھرے پڑے تھے۔ اس کا جوان، سخت اور صحت مند جسم تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد لمبی سانس لینے سے حرکت کرنے لگتا۔ سدیش نے اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ہوش میں نہ آئی۔

کروٹ بدلی تو ایک زہد شکن زاویے سے لیٹ گئی۔ اس کے جسم میں کئی زاویے تھے کئی قوسیں تھیں اس کی طرف عورتیں بھی خاص اشتیاق سے دیکھتی تھیں۔ سدیش چاہتی تھی یہ جلدی سے ہوش میں آجائے تو وہ وہاں سے چلی جائے۔

سدیش وہاں سے رات کے دو بجے لوٹی۔ اسوقت بھی بارش ہو رہی تھی۔ خان اُسے گھر تک چھوڑ گیا۔ اس کی جیب میں پانچ روپے فیس کے تھے، دو روپے انجکشن کے، تین روپے دوا کے، دروازے پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ڈرائیور کار کے شیشے چڑھائے اندر سو رہا تھا اندر گئی تو اس کا خاوند بہت پریشان دکھائی دیا۔ ایک صوفے پر ایک نوجوان لڑکی پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ایک پہلو سے لیٹی ہوئی تھی اسکے سسکنے کی آواز سدیش کے کانوں میں اندر داخل ہوتے ہی پہنچی۔ اس کا خاوند جو لڑکی کے پاس بیٹھا کچھ کہہ رہا تھا اُٹھ کر سدیش کی طرف لپکا اور بولا" اسے کسی طرح بچاؤ سدیش! اسے میں جانتا ہوں"

سدیش اپنی میز کی طرف بڑھتے بڑھتے رُک گئی۔ ایک نظر اپنے خاوند پر ڈالی ایک اُس لڑکی پر، جو اس کی طرف پیٹھ کیے صوفے پر پڑی کراہ رہی تھی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟"

"دیکھو تو"—! اُسکے خاوند نے التجا کی۔

سدیش نے اُسے دیکھا۔ اس کے پیٹ کو ٹٹولا۔ لڑکی سخت سہمی ہوئی تھی۔

کیا کھایا ہے تم نے؟"

لڑکی منہ پر ہاتھ رکھ کر بلکنے لگی۔

اُسنے لڑکی کا ایک ہاتھ کھینچ لیا۔

"بولتی کیوں نہیں؟"

اُس نے پھر خاوند کو گھورا "کس کی کرتوت ہے یہ؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لڑکی کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھے تو ہمدردی سے بھرا ہوا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا۔

"میں اِسے بچانا چاہتا ہوں" اس کا خاوند اس کے پاس جا کر گڑگڑایا۔

"لیکن کیوں؟"

"اسے میں پڑھاتا ہوں"

اسے بچانے کی درخواست اِس کے باپ کو کرنی چاہیئے۔ وہ کہاں ہے؟"

اس کا خاوند خاموش ہو گیا۔ پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بہت بیچارگی سے کراہی۔ اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ اس نے شلوار کے اوپر ایک لمبی ریشمی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کا ہرے رنگ کا دوپٹہ آدھا گردن میں الجھا ہوا تھا۔ آدھا پھسل کر فرش پر جا گرا تھا۔ اس کی دو لمبی ادھ کھلی چوٹیاں بھی صوفے سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ وہ کمر کے خم پر دونوں ہاتھ رکھ کر اندر کے درد کو جیسے دبانا چاہتی تھی

سدیش کا خاوند کمرے کے وسط میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ اس کی نظر لڑکی پر ٹکی ہوئی تھی۔ لڑکی نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا وہ رو کر بولی۔

"میں مر جاؤں گی!"

وہ تیزی سے کھسک کر اِس کے پاس گیا۔ اس کے آنسو پونچھے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر گھوم کر اپنی بیوی کی طرف غصے سے دیکھا جو آرام کرسی پر کمر ٹیکے آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ سو نہیں رہی تھی کچھ سوچ رہی تھی۔

وہ اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور چلا کر بولا ــــ "میں اس سے محبت کرتا ہوں،

اس سے میں نے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تم مجھے روک نہیں سکتی ہو! مجھے تمہاری کوئی پرواہ نہیں۔ جو چاہے کرلو۔ میں اسے لے جا رہا ہوں کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس۔"

یہ کہہ کر وہ غصّے سے کانپتا ہوا باہر نکل گیا۔ ڈرائیور کو بلانے۔

سدیش نے لڑکی کو گھورا۔ وہ اسے بہت بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ سدیش آہستہ سے اُٹھی۔ لڑکی کو سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

صبح پانچ بجے اسنے دروازہ کھولا، وہ بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اسکے پپوٹے بھاری تھے۔ نیند سے سخت بوجھل۔ وہ کرسی پر لیٹ گئی۔ اس کا خاوند جلدی سے اندر گیا۔ جہاں وہ لڑکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ لڑکی کو ساتھ لیکر باہر آیا۔ لڑکی کا چہرہ زرد تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی وہ بغیر سہارے کے چل نہیں پا رہی تھی سدیش کے خاوند نے اسے اپنے جسم کا پورا سہارا دے رکھا تھا وہ دونوں سدیش کے پاس سے گذرے تو لڑکی کے قدم رُک گئے۔ اسنے سدیش کی طرف احسان مند نگاہوں سے دیکھا۔ ہاتھ جوڑ کر نمستے کہی اور جانے کی اجازت چاہی سدیش نے بغیر آنکھیں کھولے جواب دیا: "اپنے ڈیڈی سے کہنا انہیں انگلینڈ بھجوانے کا بھی انتظام کر دیں!" اور پھر جب وہ حیران اور کچھ سوچتے ہوئے باہر چلے گئے تو اس نے ملازمہ کو آواز دی جو اندر کے کمرے میں ہاٹ ٹھنکھنا رہی تھی —

"باہر کا دروازہ بند کر آؤ ——"

ہم سفر

سنہ ۱۹۵۹ء

مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے بہت سے لوگ آئے تھے۔ بیوی، بچے، والدین، بھائی، بہنیں، دوست اور دوسرے کئی لوگ، جن میں کچھ کو تو میں جانتا بھی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے اپنی ملازمت کے طفیل انجانے میں مجھ سے کبھی اُن کی خدمت ہوگئی ہو۔ بہرحال ان سب نے مجھے پھولوں سے لاد دیا اتنے زیادہ پھولوں سے کہ میں ان کا بوجھ یقیناً محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن ان کی عقیدت کے اتنے بڑے مظاہرے کے سامنے مجھے گاڑی چھوٹنے تک گاڑی کے دروازے میں کھڑا رہنا پڑا، مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ جوڑ کر سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے منزل پر پہونچتے ہی سب کو خط لکھنے کا وعدہ کرتے ہوئے۔

گاڑی چھوٹنے سے ایک آدھ منٹ پہلے کسی نے کہہ دیا: "یہ ڈبہ راستے میں کٹ جائے گا۔"

یہ انکشاف میرے اور میرے دوستوں کے نزدیک ایک بم کے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ سب اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کوئی اسٹیشن اسٹاف سے تصدیق کرنے کے لیے لپکا کوئی گاڑی میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافروں سے پوچھنے لگا۔ میں بھی گھبرایا اتنے سارے سامان کے ساتھ راستے میں رات کو کہاں مارا مارا پھرتا رہوں گا لیکن شکر ہے کہ اسی وقت کوئی یہ خوشخبری بھی لے کر آگیا کہ میرا ڈبہ راستے میں

نہیں کٹے گا۔!

میرے کمپارٹمنٹ میں ابھی تک صرف ایک ہی مسافر تھا۔ برتھ چار تھے۔ جب گاڑی روانہ ہوئی اور میں سب کی طرف ہاتھ لہرا کر پلٹا تو اپنے ہمسفر کو ایک برتھ پر اطمینان سے کچھ لکھتے ہوئے پایا۔ میرا خیال تھا وہ میرا شاندار فیئرویل دیکھ کر میری طرف ضرور متاثر اور مرعوب نظروں سے دیکھ رہا ہوگا۔ لیکن خیر!

میں نے پھولوں کے ڈھیر سارے ہار اُتار کر اپنے برتھ پر رکھ دیے۔ اور انہیں مُسکرا مُسکرا کر دیکھنے لگا۔ اَن گنت رنگ برنگے اور کئی طرح کی خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے پھول تھے۔ ایسے پھول پیش کرنے والوں سے میں کتنی بار لڑا ہوں گا، الجھا ہوں گا۔ انہیں سخت سُست بھی کہا ہو گا۔ ان کے کئی کام پورے نہیں کیے ہوں گے۔ وہ بھی مجھ سے ناراض اور نا مہربان رہے ہونگے لیکن آج کا دن کتنی مسرتوں اور حسرتوں کا دن تھا۔ کاش میں کسی سے نہ لڑا ہوتا۔ اگر ابھی اسی وقت میں لوٹ جاؤں، میرا تبادلہ منسوخ ہو جائے۔ میں ایسی محبت بھری دُنیا چھوڑ کر اتنی دور کیوں جا رہا تھا؟ جانے اجنبی شہر میں مجھے پھر اتنی محبت کرنے والے ساتھی ملیں نہ ملیں۔!

میں نے پھولوں کے ڈھیر کو پھر چھوا۔ ان کی خوشبو کو ناک کے ذریعے اندر لیجا کر جیسے اپنی روح میں اُتار لیا۔ پھر جی چاہا رات بھر ان پھولوں سے لپٹ کر سویا رہوں! اگر میں کمپارٹمنٹ میں تنہا ہوتا تو سچ مچ ایسا ہی کرتا۔ لیکن وہاں ایک ہم سفر!

میں نے ہمسفر کی طرف دیکھا اور دل پر ایک ہلکا سا صدمہ محسوس کیا کہ اُس نے ابھی تک میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں تھا! اُسی طرح قلم ہلانے میں مصروف تھا۔ دُبلا، پتلا، چھوٹا قد، کرتا پاجامہ اور جواہر جیکٹ پہنے، کم عمر لیکن ہلکی ہلکی داڑھی

مونچھ اُگائے اور سر کے بال بغیر سنوارے جیسے کوئی بہت بڑا فلاسفر ہو! خود سے اور گرد و پیش سے سچ مچ ہی بے نیاز ہو۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس روک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جہاں ملازمت کے گزشتہ بیس سال گزارے تھے وہ مقام تیزی سے پیچھے ــــ بہت پیچھے سرکتا جا رہا تھا۔ میرے حلق میں جیسے کوئی چیز آ کر اٹک گئی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک سکتے تھے۔ لیکن میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنے ہم سفر سے اس لیے مخاطب ہوا کہ کمپارٹمنٹ کی تکلیف دِہ خاموشی بہرصورت ٹوٹنی چاہیئے تھی۔

"معاف کیجئے ــــ یہ ڈبہ کہیں راستے میں کٹے گا تو نہیں؟"

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ انتظار کیا۔ ہونٹ بھینچے، تلملایا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ نگاہ ہی نہ اُٹھائی۔ اُسی طرح قلم ہلانے میں مصروف رہا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو پھر سوچا ممکن ہے اونچا سُنتا ہو!

"معاف کیجیے گا ــــ آپ کہاں تک جائیں گے؟"

اُس نے ابھی تک برتھ پر بستر بھی نہیں بچھایا تھا۔ ایک کونے میں اُس کا لوہے کا ٹرنک، ایک اٹیچی، اور بند ہولڈال پڑا ہوا تھا۔ لیکن اُس نے میرے اِس سوال کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔

اب میں نے خود کو بہت ہی ہیچ محسوس کیا۔ بہت ہی کم تر۔ اُس نے میری توہین کی تھی۔ میرا دل غصّے اور نفرت سے بھر گیا۔ اپنا سوٹ کیس کھول کر رات کا لباس پہننے لگا۔ کھڑکیوں کے شٹر بند کیے۔ چھت پر دو پنکھے تھے ایک چل رہا تھا۔ جو چل رہا تھا اُس کا رُخ میرے ہمسفر کی طرف تھا۔ میں نے بند پنکھے کو آن کرنے کی

کوشش کی۔ لیکن وہ نہیں چلا، شاید خراب تھا۔ میں نے پنکھے کو ادھر اُدھر ہلایا گھمایا لیکن وہ بند ہی رہا۔ میری جھلاہٹ کچھ بڑھ گئی۔ چاہا پنکھے کو توڑ کر باہر پھینک دوں۔ پھر میری نگاہ معاً خطرے کی زنجیر کی طرف اُٹھ گئی۔ میں نے لپک کر زنجیر کھینچ لی۔ فرسٹ کلاس کا کرایہ دے کر بھی پنکھے کا سکھ نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

گاڑی رُک گئی۔ لیکن میرا ہمسفر نہ چونکا۔ میں دانتوں کے جبڑے کو سختی سے دبائے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ باہر دیکھا۔ اندھیرے میں انجن کی طرف سے ایک فائرمین اور گاڑی کے آخری سرے کی طرف سے ٹرین گارڈ ہاتھ میں لیمپ اُٹھائے چلے آرہے تھے۔

"کیا ہوا سر؟"

میں نے انہیں بند پنکھا دکھا دیا اور شکایت کرنے کی دھمکی دی۔ گارڈ نے پنکھے کو چلانے کی کوشش کی۔ پھر ہار کر معذرت کرتے ہوئے بولا۔

"اگلے بڑے اسٹیشن پہ اسے ٹھیک کرا دیا جائے گا۔ تھوڑی دیر کی زحمت اور گوارا فرمائیے۔"

میرا غصہ تو فرو نہیں ہوا تھا لیکن اب راستے میں کیا بھی کیا جا سکتا تھا! ناچار گاڑی کو آگے بڑھنے دیا۔

اپنے برتھ پر واپس آیا تو ہمسفر کو اسی طرح لکھنے میں مصروف پایا۔ اُسے کیا پرواہ ہو سکتی تھی؟ اُس کی طرف تو پنکھا چل رہا تھا۔ چند منٹ تک بے حس و حرکت بیٹھا رہنے کے بعد میں نے اچانک اُٹھ کر چلتا ہوا پنکھا اپنی طرف گھما لیا۔ سوچا، اس نے کچھ کہا تو معذرت کر لونگا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہوا کھانے کا میرا بھی حق تھا!

لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور پنکھا میری طرف ہوا پھینکتا رہا۔ اس بات کی مجھے ندامت بھی تھی۔ تھوڑی دیر تک ہوا کھا لینے کے بعد جب پنکھے کا رُخ پھر اُسکی طرف گھما دیا تب بھی اُس کے منہ سے "شکریہ" کا ایک لفظ سننے کو نہیں ملا۔

میں نے پھولوں کے ہار ایک ایک کر کے کھونٹی پر لٹکا دیے۔ سارا کمپارٹمنٹ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے آئس بکس میں رکھی ہوئی بیر کی بوتل نکالی۔ میرے پاس گلاس دو تھے لیکن ہمسفر کی لاپروائی کے پیش نظر اپنے سامنے ایک ہی گلاس رکھا اور دھیرے دھیرے پینے لگا۔ بیر کی تیز خوشبو نے بھی اُسے متاثر نہ کیا۔ وہ اسی طرح مست اور بے خبر بیٹھا لکھتا رہا۔

میری جھلاہٹ اب حیرانی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ضرور عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ ہو سکتا ہے بالکل بہرہ ہی ہو لیکن دیکھ تو سکتا تھا! اس نے میری کونسی حرکت نہیں دیکھی تھی۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ ایک بار بیت الخلا میں بھی گیا تھا لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ اس نے میری طرف بالکل کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مجھے ایسے ہمسفر کی موجودگی سے سخت وحشت ہو رہی تھی۔

اگلے اسٹاپ پر گاڑی رُکی تو گارڈ اپنے ساتھ ایک بجلی مکینک کو لے کر آیا میں نے اس سے پوچھا۔

"اس کمپارٹمنٹ میں کسی اور کے لیے برتھ ریزرو نہیں ہے ہ،"

گارڈ نے اپنا چارٹ دیکھ کر بتایا "ایک صاحب کے لیے یہیں سے ریزرو ہے"

یہ سُن کر میں بہت خوش ہوا۔ میرا پنکھا بھلے ہی ٹھیک نہ ہوتا۔ لیکن مجھے ایک ایسے ہمسفر کی ضرورت تھی جو میرے ساتھ باتیں کرتا۔ چاہے دو تین باتیں ہی۔ میں اس

خاموشی سے سخت گھبرایا ہوا تھا جو پچھلے دو گھنٹوں سے میرے ڈبے پر طاری تھا۔

لیکن میری بدقسمتی کہ وہاں سے تیسرا مسافر سوار نہ ہوا اور گاڑی چل دی۔ میں اپنے بستر پر بہت بے دلی سے لیٹ گیا۔ کبھی اِس کروٹ لیٹتا کبھی اُس کروٹ۔

کبھی ٹانگیں اُٹھا کر کھڑکی کے اوپر رکھ دیتا۔ کبھی خود کھڑکی کھول کر باہر جھک جاتا سخت بے چینی کی کیفیت میں سفر کٹ رہا تھا۔ نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ ساڑھے دس بج گئے تھے۔ صبح پانچ بجے گاڑی تبدیل کرنی تھی۔ ڈر! کہیں سو یا رہا تو کسی اور طرف نکل جاؤنگا گارڈ کو مطلع کرنا ضروری تھا۔ اپنے ہمسفر سے تو ایسی توقع کرنا فضول تھا۔

مزید آدھ گھنٹہ میں نے صبح کے باسی اخبار اور ایک ہفتہ وار پڑھنے میں گزار کر سونے کا فیصلہ کر لیا۔ بتی آف کرنے کے لیے اُٹھا تو جھجک گیا۔ وہ ابھی تک قلم چلانے میں مصروف تھا میں نے کہا — "اگر آپ اجازت دیں تو لائٹ آف کر دوں؟"

یہ پوچھ کر میں خوش بھی ہوا کہ اگر اس نے انکار بھی کر دیا تو میں بخوشی سرِ تسلیم خم کر دوں گا میں چاہتا تھا وہ کسی طرح ایک بار اپنے لب وا کرے لیکن تعجب کی بات کہ اس نے میری طرف بس ایک لمحہ کے لیے گھور کر اپنے برتھ کے ساتھ لگی ہوئی ہیڈ لائٹ روشن کر لی۔ جس سے روشنی صرف اُسی پر پڑ سکتی تھی اور وہ میرے آرام میں خلل ڈالے بغیر آرام سے لکھ پڑھ سکتا تھا۔

میں نے اپنے ہونٹ چبا کر لائٹ آف کر دی اور لیٹ گیا۔ وہ اپنی ننھی اور دھندلی روشنی میں بیٹھا لکھنے میں مصروف تھا۔ کمپارٹمنٹ کی ہر چیز دھندلی اور پُر اسرار نظر آنے لگی تھی۔ میں بند کھڑکی کے شیشے پر ہاتھ پھیرنے لگا جیسے کوئی بچہ سوتے سوتے ماں کا جسم ٹٹولنے لگتا ہے۔ اور پھر میں نہ جانے کب سو گیا۔ آنکھ کھلی تو اُسے اپنا سامان سمیٹتے ہوئے پایا۔ وہی اپنی آس پاس بکھری ہوئی کتابیں اور کاپیاں۔

میں بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر دیکھا۔ روشنی پھیل چکی تھی۔ گھبرا کر پوچھا — کیا دہلی گزر گیا؟"
یہ سُن کر اُس نے مجھے گھورا۔ حیرانی سے گھورا۔ مجھے فوراً احساس ہوا۔ میں نے پھر بیوقوفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایسے لاپرواشخص کے ساتھ تو کوئی بات بھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن خلافِ توقع — بالکل خلافِ توقع وہ مُسکرا دیا اور کہنے لگا۔

"دہلی تو آنے والا ہے۔ کیا آپ دہلی جائیں گے؟"

اُسے اپنے ساتھ ہمکلام ہوتا دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اگرچہ ایک لمحہ کے لیے جی میں یہ بھی آئی کہ اُسے جواب نہ دوں۔ اب میں بھی ویسا ہی رویہ اختیار کروں جو اُس نے میرے تئیں شب بھر اختیار کیے رکھا تھا۔ لیکن میں نے جلدی جلدی اپنا بستر سمیٹتے ہوئے اُس سے کہا — جی نہیں! مجھے مرادآباد جانا ہے۔ دہلی پہنچتے ہی مرادآباد کی گاڑی مل جاتی ہے۔"

"اچھا —" وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنی داڑھی اور سر کے بال سنوار رہا تھا۔

اُسکے ساتھ بات کرنے کی خوشی سے میرے جذبات اُمڈ آئے تھے۔ میں نے اُس سے شکایت کرنے میں دیر نہ لگائی۔

"کل سے آپ نے میری طرف جو بے توجہی برتی ہے۔ اس کا مجھے سخت رنج ہے۔!"

یہ سُن کر وہ مجھے گھورنے لگا۔ بڑی بڑی حیران آنکھوں سے دیکھا جو بعد میں مُسکرا دیں۔

اُسنے برتھ پر سے ایک بڑی کاپی اُٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا آپنے، میں نے آپکی طرف بے توجہی برتی؟"

میں نے کاپی میں دیکھا ساری کاپی ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویروں سے بھری پڑی تھی جو میری تھیں۔ میری۔ ہر پوز میں۔ ہر زاویہ پہ۔ ہر کیفیت کی، غصہ، بیچینی، جھنجھلاہٹ، مسرور، پھولوں پر جھکا ہوا، تکیے کے ساتھ الجھتا ہوا اور رات دھندلکے میں کھڑکی کے شیشے پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتا ہوا۔ جیسے کوئی بچہ نیند میں!

دس[۱۰] بیس[۲۰] تیس[۳۰] اور سو[۱۰۰]

۱۹۵۹ء

آٹھ بج چکے ہیں۔ گاڑی دس بجے چھوٹ جائے گی۔ صرف دو گھنٹے باقی ہیں۔ نرائن داس جلدی جلدی دوکان بڑھانے میں مصروف ہے۔ کھلے ہوئے ریشمی اور سوتی کپڑے کے تھان لپیٹ رہا ہے۔ اس کے پڑوسی دوکانیں بند کر چکے ہیں سامنے کی قطار میں صرف ایک ہی دوکاندار باقی ہے وہ بھی اس سے پہلے اپنی دوکان بند کر لے گا۔ سردی کا موسم ہے۔ آٹھ بجے کے بعد امین آباد میں گاہک بھی نظر نہیں آتے۔

نرائن داس کی واسکٹ کی جیب میں سات سو روپے ہیں۔ سو سو کے سات نوٹ۔ وہ چھوٹے سے آہنی سیف میں سے بہت سے چھوٹے نوٹ نکال کر اپنی جھولی میں ڈال لیتا ہے اور پھر جلدی جلدی ایک ایک، دُو دُو، پانچ پانچ اور دس دس کے نوٹ الگ الگ کرنے لگتا ہے۔ چاہتا ہے انہیں جلدی سے کسی دوسرے دوکاندار کے پاس جاکر بڑے نوٹوں میں تبدیل کرائے اور ان کے بدلے سو سو کے نوٹ لے لے۔ سفر میں جیب کا وزن جتنا کم ہو اچھا رہتا ہے۔ اُسے دس کی گاڑی سے فرخ آباد جانا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب دس ہزار کے بھی نوٹ ہوتے تھے۔ تب بٹوارہ نہیں ہوا تھا وہ میانوالی سے امرتسر کپڑا خریدنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی دہلی تک بھی

آجاتا تھا۔ دس دس ہزار کے تین چار یا پانچ نوٹ شلوار کے نیفے میں ڈال کر گاڑی میں بڑے اطمینان سے سوجاتا تھا۔ اب تو اس کے پاس اتنے روپیے جمع نہیں ہوتے۔ جو دکان بھی چھوٹی سی ہے۔ لکڑی کا اسٹال ہے پانچ ہزار سرکار سے قرضہ ملا تھا۔ دو اڑھائی ہزار پاس سے ملایا تھا۔ گزشتہ چار سال سے کاروبار کی چھوٹی سی گاڑی کو کسی نہ کسی طرح آگے بڑھا رہا ہے۔ اس بات کے خطرے کے باوجود کہ میونسپلٹی اِن لکڑی کے اسٹالوں کو کسی وقت بھی اُٹھا کر پھینک دے گی وہ اپنے جیسے دوسرے دوکانداروں کی طرح دن رات محنت کر رہا ہے، بال بچوں کی فکر، دُنیا داری کی فکر، بازار کی تیزی اور مندے کی فکر، اس کے سامنے فکر ہی فکر ہے لیکن وہ اِن جھاڑیوں کو پیروں تلے روندتا، دائیں بائیں ہاتھ سے ہٹاتا ہوا — جو کچھ بچا پاتا ہے، کبھی سو سو کے دس نوٹ کبھی بیس، ہفتے میں بدھ کے بدھ فرخ آباد یا کان پور یا ٹانڈا کی طرف نکل جاتا ہے۔ جمعرات کو چھٹی رہتی ہے۔ ایک اسی دن میں ضرورت کے مطابق مال خرید کر شکر وار کی صبح واپس آجاتا ہے۔ اُسے دُکھ اس بات کا ہے کہ وہ گھر میں تنہا کام کرنے والا ہے نہ باپ نہ بھائی۔ دوکان کو بند کر کے بھی کہیں نہیں جا سکتا۔ اس لیے وہ دیر وار کو اکثر گھر پر نہیں ہوتا۔

آج بدھ وار ہے۔ اس کے پاس آٹھ سو روپے ہیں۔ چار سو آج کی بکری کے چار سو سامنے والے دوکاندار سے اُدھار لیے ہیں۔ دو سو کے چھوٹے نوٹ ہیں وہ جیب کے اور سیف کے تمام نوٹ ملا کر گنتا ہے تو چونک پڑتا ہے۔ سَو کا ایک نوٹ کم ہے۔ گھبرا کر پھر گنتا ہے۔ پھر بھی ایک نوٹ کم ہے! پندرہ منٹ گزر جاتے ہیں

بازار بند ہو رہا ہے۔ اسے اسٹیشن پر جانے سے پہلے گھر بھی پہنچنا ہے۔ کھانا کھانے اور بستر اُٹھانے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک نوٹ کم ہو گیا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے سوچنے لگا ہے، قوتِ حافظہ پر زور ڈالتا ہے، کہاں گیا ہوگا ــــ ایک نوٹ!!

ایک گھنٹہ پہلے ــــ اُس نے سامنے والے دوکاندار سے تین سو کے چھ نوٹ تبدیل کرائے تھے۔ اُس دُکاندار نے اپنی طرف سے سو کا نوٹ اس غرض سے دیا تھا کہ وہ فرخ آباد سے اُس کے لیے بھی کچھ ریشمی فرد خرید کرلے آئے گا۔ جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا اُس نے سو سو کے چار نوٹ اچھی طرح گن کر اپنی جیب میں رکھے تھے۔

وہ پھر یاد کرتا ہے ــــ جب وہ اپنی دوکان سے اُٹھ کر اسی بازار کے سرے پر مٹھال دولت مل کے ہاں اُدھار مانگنے کے لیے گیا تو تب بھی تمام روپیہ اس کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اُس جیب میں روپیوں کے سوا اور کوئی دوسرا کاغذ نہیں رکھا ہوا تھا اس لیے یہ سوچنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے کہ کاغذ نکالتے وقت ایک نوٹ بھی گر گیا ہوگا۔

سامنے کی دوکان بند ہو چکی ہے۔ وہ تمام روپے واسکٹ کی جیب میں پھر سے رکھ کر دُوکان کے اندر اِدھر اُدھر غور سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے بند سمیٹے ہوئے کپڑے کے تھانوں اور بنڈلوں کے درمیان کہیں سو کا نوٹ چھپ کر بیٹھا ہوا اس کی پریشانی کا تماشہ تو نہیں دیکھ رہا ہے! اس طرح ایک نظر دیکھ لینے کے بعد اس کے دل میں آس کی کرن جنم لیتی ہے۔ وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ان تمام تھانوں اور بنڈلوں کو کھول ڈالتا ہے جس نے دن بھر انہیں کھولا اور لپیٹا تھا

ریشمی اور سوتی کپڑوں کے تھان سمندر کی لہروں کی طرح پھیلنے لگتے ہیں، لیکن رنگ اور ریشم کے اس طوفان میں سے سو روپے کے نوٹ کی کشتی اُبھرتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ نرائن داس کی آنکھوں میں مایوسی کی راکھ جمتے جمتے پھر پھٹ جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں پھر سے چمک اُٹھتی ہیں۔ وہ ایک کھلے ہوئے تھان کی طرف پھر سے متوجہ ہو جاتا ہے۔ اُسے باقی کپڑوں سے الگ کر کے اچھی طرح کھول کر دیکھتا ہے۔ چھاپے کی ریشمی کریپ کا چوبیس گز لمبا تھان تھا۔ شام کو ساڑھے چھ بجے اس نے اس تھان میں سے ایک گاہک کے لیے چھ گز کپڑا کاٹا تھا۔ اس گاہک نے اور بھی بہت سا کپڑا خریدا تھا۔ وہ اس کا پرانا گاہک ہے۔ اکثر اُدھار لے جاتا ہے۔ ہر مہینے تنخواہ پر تھوڑا تھوڑا کر کے لوٹاتا رہتا ہے غریب ہے لیکن بددیانت نہیں ہے۔ آج بھی اس نے ادھار لیا ہے۔ چھیانوے روپے نوآنے کا بل بنا رکھا ہے۔ جس وقت اس نے سامنے والے دکاندار سے چھوٹے نوٹ تبدیل کرائے تھے اس وقت وہی گاہک سودا لے رہا تھا اور یہی ریشمی تھان دونوں کے درمیان کھلا پڑا تھا۔ نرائن داس نے اسی تھان کے اوپر رکھ کر اس کے خریدے ہوئے کپڑے ایک اخبار کے کاغذ میں لپیٹے تھے اس کا ذہن یہ بات قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ جب اس نے سو سو کے نوٹ ایک ساتھ جوڑ کر جیب میں رکھنے کی کوشش کی ہوگی تو یقیناً ایک نوٹ نیچے رہ گیا ہوگا اور اس گاہک کے کپڑوں کے ساتھ لپٹ کر چلا گیا ہوگا!! وہ تمام کپڑوں کے انبار کو ایک طرف ڈھکیل دیتا ہے۔ انہیں ٹھیک طرح سے سمیٹنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ وہ جلدی سے سیف بند کرتا ہے

جوتا پہنتا ہے، سر پر پگڑی باندھتا ہے اور دوکان سے نیچے اُتر کر آتا ہے۔ لکڑی کے تختے گرا کر لوہے کے کنڈے چڑھاتا ہے اور کنڈوں میں چھ بھاری قفل ڈال دیتا ہے، درمیانے قد کے قدرے فربہ جسم کے دوکاندار کے ذہن میں ایک ہی خیال کام کر رہا ہے کہ سو کا نوٹ اسی گاہک کے کپڑوں میں گیا ہے۔!

وہ جلدی جلدی دو طرفہ بند دوکانوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ چوکیدار اُسے آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور سلام کر کے تمبا کو پھانکنے لگتا ہے۔

نرائن داس نیا دوکاندار نہیں ہے۔ باپ دادا ہی سے یہی پیشہ چلا آتا ہے لاکھوں روپوں کا لین دین کیا ہے۔ لیکن ایسی بھول کبھی نہیں ہوئی۔ اس بھول کا احساس اب اس لیے بھی زیادہ ہے کہ جتنا کپڑا خریدنے کے لیے وہ فرخ آباد جائے گا۔ اس میں سے سو روپے کی بچت تو نہیں ہوگی۔ دوکاندار کو کسی سودے میں ہاتھ سے ایک پیسہ بھی دینا پڑ جائے تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ ان سو روپوں میں فرخ آباد میں بیس فرد خریدے جا سکتے تھے۔ اور انہیں یہاں لا کر سب اخراجات جوڑ کر بیچنے میں دس روپے تو ضرور بچ سکتے تھے۔ اس وقت نقصان ایک سو کا نہیں ایک سو دس کا ہے۔ اس سردیوں کی وجہ سے رضائیوں کا کپڑا خوب بک رہا ہے۔ بازار میں اس کپڑے کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ جب اپنے ذہن میں یہ خیال بخوبی بٹھا لیتا ہے کہ اسی گاہک کے ساتھ سو کا نوٹ گیا ہے تو اس کے دل میں گاہک کے خلاف نفرت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ بار بار اُدھار لے جانے کی، تھوڑا تھوڑا روپیہ ادا کرنے کی۔ ادھار کا زمانہ کہاں ہے اب! پچاس کو مہینے میں پچاس مرتبہ گھمایا جا سکتا ہے اور ہر مرتبہ گھمانے پر دو چار روپے تنے

بطور منافع ٹیک ہی پڑتے ہیں۔ جو گاہک پچاس روپے کا اُدھار کر پانچ مہینوں میں ادا کرے گا تو دوکاندار کا کتنا نقصان ہوگا؟ پھر کپڑے کو دس مرتبہ دیکھا جاتا ہے بیسوں نمونے دیکھے جاتے ہیں۔ دوکاندار پر زیادہ دام لگانے کا شک تک کیا جاتا ہے اور پھر یہ توقع بھی رکھی جاتی ہے کہ دوکاندار اُٹھ کر سلام بھی کرے جیسے باپ کے نوکر ہوتے ہیں دوکاندار! وہ دل ہی دل میں اس گاہک کو دُو چار غلیظ ترین گالیاں دے دیتا ہے۔

چوراہے پر بیٹھ کر وہ بس کا انتظار کرنا بیوقوفی سمجھتا ہے۔ ایک رکشا میں بیٹھ کر صدر کا رُخ کرتا ہے جہاں وہ گاہک رہتا ہے وہ اس کا گھر جانتا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اس کے لڑکے کے مونڈن پر گیا تھا۔

ابھی نو نہیں بجے۔ وہ صدر سے ہو کر عالم باغ میں اپنے گھر بھی پہنچ سکتا ہے اور پھر وہاں سے اسٹیشن! ایک گھنٹے کے اندر اگر کوئی اور کام نہ پڑ جائے۔ تو وہ بخوبی اب کام کر سکتا ہے۔ نوٹ کا پتہ نہیں چلا تب بھی تو اسے فرخ آباد جانا ہے۔ اسی نقصان کے ساتھ اور زیادہ نقصان کیوں اُٹھائے؟ ہاں یہ سو کا نوٹ مل جائے تو ذرا اطمینان ہو جائے گا۔ پریشانی ختم ہو جائے گی۔ رکشا میں بیٹھے بیٹھے اس نے دل ہی دل میں سفر کے اخراجات کا پورا پورا تخمینہ لگا لیا ہے۔ رکشا۔ قلی۔ ریل کا ٹکٹ اور فرخ آباد میں کھانا۔ لسّی تک کے دام جوڑ لیے ہیں۔ چند منٹ کے لیے اس کا دھیان ضرور نقصان سے دور چلا جاتا ہے۔ لیکن پھر واپس چلا آتا ہے اور وہ گاہک کو پھر سے گالیاں دینے لگتا ہے، دل ہی دل میں!

جب وہ صدر پہونچ کر گاہک کے مکان کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو اُسے اندھیری

گلی میں سو کا نوٹ جگنو کی مانند چمکتا اڑتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے۔ نوٹ مل جانے کی اُمید اسکے ذہن میں سے غصہ نکال پھینکتی ہے اور وہ گاہک کو نہایت شیریں لہجہ میں پکارنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جب وہ اسے پکارتا اور دروازے پر دستک دیتا ہے تو اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گھر کے لوگ سو روپے کا بٹوارہ کر رہے ہیں اور اُسکی آواز سُن کر سنبھلنے کی کوشش کر رہے ہوں!

دروازے پر گاہک کی ادھیڑ بیوی نمودار ہوتی ہے۔ دھوتی کا پلّو درست کرتی ہوئی اُسے پہچاننے کی کوشش کرتی ہے۔ نرائن داس دونوں ہاتھ جوڑ کر جے رام جی کی کہتا ہے اور اُسے بتاتا ہے کہ وہ نرائن داس ہے، پنجاب کلاتھ اسٹورز والا!

"اوہ آپ خود آ گئے! انہیں آتے ہی میں نے کہا کہ آپ ابھی جا کر روپیہ دے آئیے گھر میں رہتا ہے تو ادھر اُدھر خرچ ہو جاتا ہے۔"

یہ سُن کر نرائن داس کی جان میں جان آ جاتی ہے۔ ایک لمحہ میں اُسے اپنی دی ہوئی گالیاں بھی یاد آ جاتی ہیں وہ اپنے آپ کو بہت جلد باز اور حقیر سمجھتا ہے۔ ہاتھ جوڑ کر جلدی سے بول اُٹھتا ہے: "مجھے افسوس ہے کہ میں چلا آیا مجھ سے ذرا سی دیر کے لیے صبر نہ ہو سکا روپے کی ضرورت سے آنا پڑ گیا۔ بابو جی کہاں ہیں میں اُن سے معافی مانگوں گا!"

وہ عورت دھوتی کا پلّو پھر سے درست کرتی ہے اور کہتی ہے "وہ تو آپکو روپیہ دینے کے لیے سٹیشن گئے ہوئے ہیں۔ کہتے تھے کہ آپ دس بجے کی گاڑی سے فرخ آباد جائیں گے۔"

"جی ہاں جی ہاں میں ابھی دس بجے فرخ آباد جانے والا ہوں۔ میں نے انہیں آج شام کو بتایا تھا اوہ! کتنے بھلے آدمی ہیں بیچارے! میری خاطر اسٹیشن پر جانے کی تکلیف کی ہے میں سخت شرمندہ ہوں میں آپ لوگوں کے سامنے سر اُٹھانے کے قابل بھی نہیں ہا۔ جی معاف کر دیجیے گا۔ جے رام جی کی!"

یہ کہہ کر نرائن داس جلدی سے گلی سے باہر آتا ہے اُسی رکشا میں سیدھا اسٹیشن کا رُخ

کرتا ہے۔ راستے بھر میں وہ اس گاہک کی دل ہی دل میں تعریف کرتا آتا ہے۔ رکشا والے کو بھی سارا واقعہ سُناتا ہے اور اپنی جلد بازی پر بڑے زور سے قہقہے لگاتا ہے۔ اور فیصلہ کرتا ہے کہ آئندہ وہ اُسے سودے میں اور زیادہ رعایت کیا کریگا۔ ایسے شخص کو ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا چاہیئے۔ شرافت اور انسانیت کا یہی تقاضہ ہے!

نرائن داس کی فکر دور ہو چکی ہے۔ اب وہ اس گاہک سے اسٹیشن پر ہونے والی ملاقات کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں سے بہت ہی شیریں اور مناسب الفاظ کرید رہا ہے جن کے ساتھ وہ اس سے معافی مانگے گا۔ اور اُس کی تعریف کرے گا اُسے یہ سوچ سوچ کر اپنے اوپر بہت غصّہ آرہا ہے کہ جب اُسے گھر جا کر بیوی سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ سو کے نوٹ کی خاطر اس کے گھر تک پہونچا تھا وہ اسے کتنا کمینہ اور حقیر سمجھے گا!! یہ دیکھ کر اسے کتنا افسوس ہوگا کہ نرائن داس نے اس پر ایک سو روپے کا بھی اعتبار نہ کیا۔ پھر وہ یہ سوچکر دل کو تسلّی دینے لگتا ہے کہ انسان سے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے اب تو جل ہی گیا ہے۔ نہیں ملتا تو اُسے خود کتنا دُکھ ہوتا!! ایک بار معافی مانگ لینے پر سب ٹھیک ہو جائیگا

اسٹیشن پر پہنچتے ہی نرائن داس اُس پلیٹ فارم کی طرف لپکتا ہے جہاں سے فرخ آباد کی گاڑی چھوٹتی ہے۔ اسے بہت جلدی ہے اب وہ سو روپے لیکر گھر جانا چاہتا ہے۔ ابھی اسے کھانا کھانا ہے اور بستر اُٹھانا ہے۔ سوا نو بج چکے ہیں۔

وہ پلیٹ فارم پر دور تک نگاہ دوڑاتا ہے۔ ایک نظر میں بے شمار چہرے دیکھ لیتا ہے۔ مطلوبہ چہرہ دکھائی نہیں دیتا تو وہ مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی بیتابی اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ جلدی جلدی تمام مسافروں کو گھورتا ہوا آگے بڑھتا ہے سب کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔ اور اچانک ایک جگہ ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"نمستے بابو جی۔!"

پینتالیس سال کے درمیانے قد کا ٹھنڈی پتلون اور پرانا گرم کوٹ پہنے ہوے ایک شخص مسکرا کر اس کے ساتھ ہاتھ ملاتا ہے، اور کہتا ہے — "سیٹھ جی! میں آپ سے ہی ملنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

"شکریہ شکریہ! مجھے آپ سے یہی توقع تھی لیکن اس بات کے لیے معافی کا خواستگار ہوں کہ آپ کو میرے لیے بہت تکلیف اُٹھانا پڑی ہے۔"

"نہیں سیٹھ جی۔ یہ تو میرا فرض ہے کہ جیسی ضرورت کے وقت آپ ہماری مدد کرتے ہیں ویسے ہی میں بھی آپ کی مدد کروں۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو روپیوں کی ضرورت ہے کیونکہ آپ فرخ آباد جائیں گے۔ میں ادھار لینا بہت بُرا سمجھتا ہوں لیکن مجبوراً لینا بھی پڑ جاتا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ کپڑا لے کر گھر پہنچا تو آپ کی بھابی مجھ پر بہت بگڑیں۔ وہ بھی اُدھار لینے سے گھبراتی ہیں۔ فوراً اپنے پاس کے جمع کیے ہوے روپے نکال کر مجھے دیے اور کہا ابھی جا کر انہیں روپے پہنچائیے۔ میرا خیال ہے آپ پورا بل وصول کر کے بہت خوش ہونگے۔ یہ لیجیے سب دس دس کے نوٹ ہیں، دس، بیس، تیس، پورے سو ہیں۔ خود ہی گن لیجیے۔ اور یہ وہ بل چھیانوے روپے نو آنے!!"

یہ کہہ کر ادھیڑ عمر کا دُبلا پتلا بابو زور زور سے ہنسنے لگتا ہے اور نرائن داس اپنے جسم کے اندر جیسے اور تھوڑا سکڑ جاتا ہے اور اس کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔

روشنی اور سائے

سنہ ۱۹۵۷ء

دینا ناتھ دفتر سے تین دن سے غیر حاضر تھا اس نے چھٹی کے لیے کوئی درخواست بھی نہیں بھیجی تھی۔ قیاس یہ تھا کہ وہ بیمار ہو گا اس کی غیر حاضری میں ٹائپ کرنے کا کچھ کام گپتا صاحب نے کپل دیو کو سونپ دیا تھا لیکن ابھی تک اسے بہت ضروری اور راز میں رکھی جانے والی خاص فائلیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ان فائلوں کو دیکھنے کے لیے ایسا زیادہ خواہشمند بھی نہیں تھا، پھر بھی وہ سوچتا تھا کہ گپتا صاحب دینا ناتھ کی غیر حاضری میں خود سارا کام کب تک دیکھیں گے۔

چار پانچ روز کے بعد صاحب کو دورے پر جانا پڑ گیا۔ ان کے ساتھ ایک اسٹینو گرافر کا جانا بہت ضروری تھا آج تک تو ان کے ساتھ ان کا پرانا اسٹینو گرافر دینا ناتھ ہی گیا تھا۔ جب صاحب نے کپل دیو کو ہیڈ کلرک کے ذریعہ بلا بھیجا تو ہیڈ کلرک نے کپل دیو کو اپنے پاس بٹھا کر نہایت ہی رازدارانہ لہجہ میں کہا " دیکھو بیٹا! آج تمہیں ایک بہت ہی سنہرا موقع ملا ہے اب صاحب کی ایسی خدمت کرو کہ انکی نظروں میں آجاؤ۔ مجھے یقین ہے تم ایک دن ضرور ترقی کرو گے۔ دنیا میں سب کام خدمت اور خوشامد سے ہوتے ہیں "

یہ سن کر کپل دیو مسکرایا، جواب دیا " بڑے بابو آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ میں کسی کی خوشامد نہیں کرونگا۔ ایسی ترقی چاہے مجھے کبھی نہ ملے جو مجھ سے میری غیرت

اور خودداری چھین لے۔"

"یہ تمہارا پاگل پن ہے بیٹا! ابھی تمہیں زمانے کی بے رحمی کا پورا احساس نہیں ہوا ہے تم میرے تجربات سے فائدہ اُٹھاؤ، میں نے سب نشیب و فراز دیکھے ہیں، جب میں اس دفتر میں ملازم ہوا تھا تب مجھے اس دفتر میں صرف ۲ اروپے تنخواہ ملا کرتی تھی۔ آج میں دفتر کا سب سے پرانا ملازم ہوں۔ میرے دیکھتے دیکھتے کتنے معمولی آدمی آگے بڑھ گئے۔ تم میرے مرحوم دوست کے بیٹے بھی ہو، اس لیے تمہیں ہدایت دینے اور سمجھانے کا مجھے حق حاصل ہے؟"

"جی میں آپ کی شفقتوں کو کبھی نہیں بھلا سکتا میری یہ ملازمت بھی آپ ہی کی وجہ سے ہے لیکن میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ افسروں کی خوشامد کرتے پھرنا میرے مزاج میں داخل ہی نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو ان لوگوں سے مختلف پاتا ہوں بلکہ مجھے تو ان کے بال بچوں پر بڑا ترس آتا ہے جو افسروں کی خدمت کے جذبے میں انہیں بھی بھولے رہتے ہیں۔"

ہیڈ کلرک نے کپل دیو کی بات پسند نہ کی۔ قدرے غصے سے بولا "اچھا جاؤ صاحب تمہارے انتظار میں ہیں، تمہیں ساتھ دورے پر لے جائیں گے۔"

کپل دیو نے منہ بنا کر کہا ــــ "بڑے بابو، آپ مجھ پر ایک اور احسان فرمائیں گے اگر میری بجائے صاحب کے ساتھ دورے پر کسی دوسرے کو بھجوا دیں۔"

"اب جاؤ بھی، کونسی بڑی آفت آجائے گی دو ہفتوں کے دورے میں۔"

بڑے بابو کی گھنی مونچھوں کے گچھے ہوتے ہل کانپ گئے، وہ کچھ مسکرائے بھی اور عینک کے اوپر سے گھور کر دیکھا۔ کپل دیو وہاں سے ہٹا نہیں۔ میز پر پھر جھک کر بولا

"آپ جانتے ہیں مجھے دوستوں کے ساتھ روزانہ رمی کھیلنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں میرا شغل جاری نہ رہا تو میں بیمار پڑ جاؤں گا۔"

یہ سُن کر ہیڈ کلرک کے ارد گرد اپنی میزوں پر بیٹھے ہوئے کلرک ہنس پڑے ایک کلرک نے کہا "ٹھیک تو ہے بڑے بابو، کپل دیو کے بغیر تو ہمارا دل بھی نہیں لگیگا۔"

ہیڈ کلرک نے مصنوعی غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کپل دیو کو صاحب کے پاس جانے کا اشارہ کیا، وہ بادلِ ناخواستہ صاحب کے کمرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا صاحب نے بُلایا تو اندر چلا گیا۔ ایک بہت بڑی چوڑی اور نفاست سے سجی ہوئی میز کے سامنے گنجی کھوپڑی والے صاحب اسے دیکھتے ہی کہہ اُٹھے "تم نے کپل دیو وہ سلیکشن کی فائل ابھی تک نہیں لوٹائی؟"

"جی ہاں وہ — اس کی ایک لسٹ ابھی ٹائپ کرنا باقی ہے کل شام کو ایک ضروری کام کی وجہ سے جلدی چلا گیا تھا۔"

"اور آج اس وقت تک؟ صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھ کر پوچھا "گیارہ! ابھی تک تم نے کام نہیں شروع کیا؟"

"شروع کرنے ہی والا تھا کہ ہیڈ کلرک صاحب نے بُلا لیا۔ میں ابھی جا کر ختم کر دونگا"

صاحب نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چپراسی اندر آیا تو اس سے کہا "شاہ صاحب کو بُلا لاؤ۔"

دوسرے ہی لمحے ہیڈ کلرک کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوا اندر آ گیا اور آتے ہی پوچھا "جی فرمائیے۔"

"میں آج دورے پر جا رہا ہوں، لکھیم پور، گونڈہ، گورکھپور، سیتا پور، اور

گوالگو کرن ناتھ جانا ہوگا۔ غالباً دو ہفتے لگیں گے۔ دینا ناتھ کا کچھ پتہ نہیں ہے، وہ میرے دورے کا سب انتظام خود دیکھتا تھا۔ میں اس پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ خیر اب مجھے کوئی ٹائپسٹ دو، جو میرے کام بخوبی انجام دے سکے۔"

یہ سُن کر ہیڈ کلرک نے کپل دیو کی طرف دیکھا، پھر ذرا اور مدھم آواز میں کہنے لگا "جناب، اسے ساتھ لے جائیے نا۔ میں اسے جانتا ہوں یہ بہت محنتی اور ہوشیار ہے، اسے موقع دیجیے خدمت کرنے کا۔"

صاحب نے سر اُٹھا کر شاہ صاحب کو گھورا اور کہا "اس کی سفارش مت کرو اسے میں نے دیکھ لیا ہے۔ اس سے ابھی تک سلیکشن کی فائل بھی تیار نہیں ہو پائی ہے۔ مجھے دینا ناتھ کی کمی بُری طرح محسوس ہو رہی ہے۔ وہ میرے مزاج اور کام دونوں سے واقف تھا۔"

"بہت اچھا جناب، میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ساتھ جانے کے لیے اور کونسا ٹائپسٹ موزوں ہو سکتا ہے۔"

"ہاں! اور دیکھو اسے میرے پاس جلدی بھیج دو۔"

صاحب پھر کاغذات پر جھک گئے۔ کپل دیو اور شاہ صاحب باہر چلے آئے، ہیڈ کلرک اب سچ مچ غصّہ میں تھا۔ اس نے کپل دیو کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ سیدھا ٹائپ سیکشن میں چلا گیا۔

کپل دیو کے بجائے رام ناتھ کو بھیجا گیا وہ دو ہفتوں کے بعد لوٹا تو دینا ناتھ واپس آچکا تھا لیکن اس کے باوجود رام ناتھ، صاحب کا منظورِ نظر بنا رہا۔ صاحب اس کے کام سے بہت خوش ہوئے تھے۔ رام ناتھ کے اندر خوشامد

اور خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس نے صاحب سے متعارف ہو جانے کا فائدہ خوب اُٹھایا۔ صاحب کے بنگلے پر راشن، کوئلہ، لکڑی تک پہونچانے کا جیسے اس نے ٹھیکہ لے لیا ہو۔ دفتر پہونچنے سے پہلے صاحب کے بنگلے پر صبح سویرے حاضری دیتا، کوئی خاص کام نہ ہوتا، پھر بھی وقت مقررہ سے کچھ دیر پہلے دفتر جا پہونچتا۔ شام کو صاحب کے دفتر سے نکلنے کے بعد اپنی میز چھوڑتا بلکہ اکثر صاحب کے ساتھ انکے بنگلے تک جاتا تھا، کبھی کبھی دفتر کے کچھ اور لوگ بھی رہتے تھے۔ صاحب نے رام ناتھ پر بھروسہ کر لیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے معاملات کی جانچ پڑتال کے لیے کبھی کبھی اُسے تنہا بھیج دیتے تھے۔

کپل دیو رام ناتھ کا مذاق اُڑایا کرتا تھا اس کا مذاق کسی حد تک حسد پر مبنی تھا۔

اسی سال دفتر میں ایک سلیکشن ہوئی، صاحب کو اپنے لیے ایک پی۔ اے کی ضرورت تھی، اور دو نئے سرکل انسپکٹر بھی مقرر کرنے تھے کافی چھان بین کے بعد تین آدمی لیے گئے۔ رام ناتھ انسپکٹر ہو گیا۔ کپل دیو کو کسی نے نہ پوچھا۔ اسکی درخواست پر غور تک نہ کیا گیا۔ ساٹھ روپے تنخواہ پانے والا اب ایک سو پچاس پانے لگا۔ دفتر میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک رشک و حسد کی لہر دوڑ گئی۔ کپل دیو دل ہی دل میں جل کر رہ گیا۔ اسے رام ناتھ کے ساتھ کسی طرح کا بیر نہیں تھا۔ اسکی حسد کی بنیاد یہ تھی کہ اس نے ایک بار موقعہ ملنے پر صاحب کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رام ناتھ اسی دن سے اسکے طنز اور مذاق کا نشانہ بن رہا تھا۔ طنز اور مذاق نے اب باقاعدہ حسد کی جگہ لے لی تھی۔ ہیڈ کلرک نے اسے کئی بار رام ناتھ کی مثال دے کر صاحب کی خدمت کرنے کے لیے کہا۔ کپل دیو یہ سب سُن کر چُپ ہو رہا

اسکی نظریں ہمیشہ رام ناتھ کے تعاقب میں رہتیں۔ رام ناتھ اب صاحب کے کمرے کے سامنے ایک چوڑی میز کے آگے بیٹھتا تھا۔ اس کے لباس اور بات چیت کے لب ولہجہ میں ایک انقلاب آ چکا تھا۔ پہلے تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر خوب قہقہے لگایا کرتا تھا۔ اب انکی باتیں سُن کر صرف مسکرا دیتا تھا۔ اب وہ ان سب سے سلام کرنے کی توقع رکھتا تھا اور واقعی یہی ہوتا تھا۔ سب ہی اسے دیکھ کر سلام کرنے لگے تھے۔ جو نہیں کرتے تھے اسکے حاسد تھے۔ اسے دورے کا جو الاؤنس ملتا تھا اسے جمع کر کے وہ ایک موٹر سائیکل خریدنے کا پلان بنا رہا تھا۔ کپل دیو نے بڑے بابو کی نصیحت پر کبھی دھیان نہ دیا۔ حسب معمول افسروں اور انسپکٹروں کی برائیاں بیان کرنے میں لگا رہتا۔ دفتر کے مقررہ اوقات کے بعد ایک منٹ کے لیے بھی وہاں نہیں رُکتا تھا کبھی زیادہ کام کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اکثر کچھ کام دوسرے دن پر ہی اُٹھا رکھتا تھا اور فالتو وقت دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں گزارتا رہا۔

دوسرے سال صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔ نئے افسر کی آمد تک ہیڈ کلرک نے ان کی جگہ پر کام کیا۔ یہ عرصہ صرف دو مہینہ کا تھا اس دوران ہیڈ کلرک نے بہت سے اہم کام کپل دیو کے سپرد کر دیے۔ اسے راز میں رکھی جانے والی فائلیں بھی پڑھنے کے لیے دیدیں۔ محکمے کی پالیسی کے تمام کاغذات اس کے ہاتھوں سے گزرنے لگے۔ وہ چاہتا تھا کہ کپل دیو دفتر کا ایک اہم کلرک بن جائے۔ اس کا کپل دیو پر ایک اخلاقی اثر بھی تھا۔ کپل دیو نے اسے ناراض نہ کرنے کے لیے تمام بوجھ بخوشی سنبھال لیا۔ ابھی تک کام میں اضافہ کے بدلے میں اس کی تنخواہ میں ایک پیسہ کا بھی اضافہ نہیں ہوا تھا محنت اور مصروفیت حد درجہ بڑھ گئی تھی۔ اب اسے گھر پہونچکر تاش کھیلنے کے لیے

وقت نہیں ملتا تھا۔ پہلے وہ دن بھر میں بمشکل پندرہ بیس کیس ٹائپ کیا کرتا تھا اب اُسے پچاس ساٹھ کرنے پڑ جاتے۔ کسی کسی فائل میں تو ایک ایک کیس چار چار اور چھ چھ صفحات کا ہوتا تھا۔

ایک دن اُس کی نظر ایک سلیکشن فائل پر پڑی۔ اوپی گریڈ اسٹاف کی بھرتی کیلئے دو سو آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس قسم کی سلیکشن کئی بار پہلے ہو چکی تھی جن دنوں دینا ناتھ یا رام ناتھ اس جگہ پر کام کر رہے تھے ان کے پاس دُور دُور سے لوگ سفارشیں لے کر پہونچتے تھے، اس لیے ان کا مزاج بہت اونچا رہتا تھا۔ جن لوگوں کو وہ فائدہ پہونچاتے تھے ان سے کتنے فائدے خود بھی اُٹھاتے۔ اسے معلوم تھا کہ رام ناتھ نے اپنی بیوی کا علاج میڈیکل کالج سے بغیر کسی سفارش یا انتظار کے کرایا تھا۔ محکمۂ تعلیم سے اس نے اپنے عزیزوں کے لیے کتنی مراعات حاصل کی تھیں۔ پولس میں بھی اس کا اثر ورسوخ اسی وجہ سے ہوا تھا۔ اس فائل کو دیکھ کر کپل دیو گہری سوچ میں پڑ گیا! ان دو سو آدمیوں کو رکھنے کے لیے تقریباً چار ہزار درخواستوں کو پڑھنا ہوگا۔ اگر وہ اس جگہ کام کرتا رہے تو اس کی اہمیت بھی بڑھ سکتی ہے۔ وہ بھی سر اونچا کر کے اور سینہ پھُلا کے چل سکتا ہے۔ شام کو گھر جانے سے پہلے اس نے ہیڈ کلرک سے اس فائل کا ذکر کیا شاہ صاحب اس کا مُدعا سمجھ کر مُسکرا دیے اور کہا — "لیکن یہ سلیکشن میں نہیں کر سکتا ہمارا نیا افسر ہی آکر کریگا"۔

کپل دیو خاموش ہو گیا۔ نئے افسر کی آمد تک وہ اسی جگہ کام کرتا رہے تب وہ کسی ذمہ داری کے اُٹھانے کے قابل بن سکتا تھا۔

جس دن نئے افسر کی آمد تھی وہ ان کا استقبال کرنے کے لیے صبح صبح اسٹیشن پر

جا پہنچا۔ وہاں دفتر کے بہت سے لوگ جمع تھے، ہیڈ کلرک، سرکل انسپکٹر، ٹھیکیدار اور کئی دوسرے۔ ان میں دو چار کلرک ایسے بھی تھے جو اس کے ساتھ کام کرتے تھے اور ہمیشہ ہر افسر کا کام کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ بہت سے لوگ پھولوں کے ہار اور گلدستے اٹھائے ہوئے تھے۔ اس بھیڑ میں اس نے اپنے آپ کو حد درجہ تنہا محسوس کیا۔ آجتک وہ کسی افسر کو الوداع کہنے یا اُن کا سواگت کرنے اسٹیشن پر نہیں آیا تھا اس نے کسی افسر کی اس حد تک خوشامد نہیں کی تھی۔ آج اس کے لیے یہ پہلا موقع تھا وہ ایک طرف کھڑا ہو کر باقی لوگوں کی حرکات و سکنات کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہا تھا وہ لوگ کس قدر خوش تھے کتنے اچھے اچھے اور صاف صاف کپڑے پہن کر آئے تھے بار بار اپنی پتلونوں کی کریز دیکھتے۔ نکٹائی کی گانٹھ چھوتے۔ سر کے بالوں کو سہلاتے، چشمہ صاف کرتے کبھی ہیٹ کو سر سے اتارتے کبھی جماتے۔ ذرا ذرا سی بات پر زور دس کا قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے اس کا جی بھی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ کھڑے ہو کر باتیں کرے اور اسی طرح قہقہہ لگائے لیکن اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ ڈو ایک آدمیوں نے اس کی طرف دیکھ کر منھ پھیر لیا تھا۔ ہیڈ کلرک نے اسے دیکھ کر محض مسکرا دینے پر ہی اکتفا کی تھی اسلیے وہ ان لوگوں کی حرکتوں میں کوئی کشش نہیں پا رہا تھا۔ اسے وہ سب کے سب بیوقوف اور غیر مہذب معلوم ہو رہے تھے۔ جب تک گاڑی نہیں آئی وہ پلیٹ فارم پر تنہا ٹہلتا رہا۔

گاڑی آجانے پر سب لوگ اس ڈبہ کے سامنے جمع ہو گئے جس میں نئے صاحب بھی تھے۔ نئے صاحب ادھیڑ عمر کے اونچے اور موٹے جسم کے مالک تھے۔ منھ میں سگار ٹھنسائے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر سلام کا جواب دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی

بیوی دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں جو اپنے ترشے ہوئے بالوں کو بار بار شانوں کے آگے گراتی اور اپنے باپ کے ماتحتوں پر جھپٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر جلنے اُدھر کس کو ڈھونڈ نے لگتی تھی۔ ایک خونخوار السیشن کتا ان کے آگے پیچھے بہت بے چینی سے پھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

ہار پہنانے والوں نے آگے بڑھ بڑھ کر صاحب کے گلے میں ہار ڈالے۔ صاحب کے ساتھ متعارف ہونے اور ان کے ساتھ ہاتھ ملانے کے لیے سبھی لوگ بیقرار نظر آتے تھے

"مجھے بھگوان سنگھ کہتے ہیں۔ میں ڈیولپمنٹ سیکشن کا انچارج ہوں۔"

"خادم کو نذر حسین کہتے ہیں، سرکار کا بہت پرانا ٹھیکیدار۔"

"مجھے رام ساگر پانڈے ــــ"

"صاحب کا اقبال بلند رہے۔ میں سرکل انسپکٹر۔"

کپل دیو سب کے پیچھے تھا۔ ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا اُسے بھیڑ کی وجہ سے اپنے نئے افسر کا چہرہ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے ایک بار آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن پھر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ساتھی کلرک اور دفتر کے کئی چپراسی صاحب کا سامان اُٹھوانے میں مصروف تھے۔ کپل دیو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ پر قبضہ کر چکا تھا۔ جب نئے صاحب اپنے بیوی بچوں اور دفتر کے قافلے کو ساتھ لے کر آگے بڑھے تو کپل دیو ایک دوسرے راستے سے ہو کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل گیا۔

اسے دفتر میں اسی جگہ پر مستقل کام نہ کرنے دیا گیا۔ وہاں وہی پہلا ٹائپسٹ لگا دیا گیا، جسے شاہ صاحب نے ہٹا دیا تھا۔ کپل دیو نے سمجھ لیا کہ اب اس کے لیے

آگے بڑھنے کا موقع مشکل سے آئے گا۔ اب وہ سچ مچ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اس نے تاش کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ اگر اسے عنقریب ترقی نہ ملی تو اس کی مالی حالت بہت گر جائے گی۔ جب تک اس کی اولاد نہ ہوئی تھی تب تک تو میاں بیوی کی گذر بخوبی ہوتی رہی تھی۔ اب بچے ہو جانے کے بعد اخراجات بڑھ گئے تھے۔ اس نے ہیڈ کلرک سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ وہ صاحب کے سامنے اس کی سفارش کریں۔ شاہ صاحب نے اسے بتایا تھا کہ ابھی اسے انتظار کرنا ہوگا۔ ابھی تو صاحب نئے نئے آئے تھے۔ ابھی تو انہیں خود صاحب تک رسائی حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ ایک سال گزر گیا کپل دیو صاحب کے نزدیک نہ پہونچ سکا۔ کبھی کبھار سامنے ہو جانے پر سلام کر دینے سے وہ بات نہیں بنتی تھی جس کا وہ متمنی تھا۔ صاحب کے بنگلے پر بغیر کسی کام کے جا کر ملنے کی اس کے اندر جرأت نہیں تھی، دو ایک کلرک جو صاحب کے آتے ہی انکی نظروں میں چڑھ گئے تھے وہی ان کے ہاں آزادی سے آتے جاتے تھے۔

ان ہی دنوں صاحب کی ایک لڑکی کی شادی قرار پائی۔ ایک افسر اگر اپنی ملازمت کے دوران اپنی لڑکی کی شادی کرتا ہے تو اس کے ہاں تحائف کے انبار لگ جاتے ہیں وہی ہوا۔ محکمے کا کوئی انچارج۔ انسپکٹر یا ہیڈ کلرک ایسا نہیں تھا جس نے تحفہ نہ پہونچایا ہو، کئی کلرکوں نے بھی نذریں پیش کیں۔ ٹھیکیدار تو جیسے اسی موقع کے انتظار میں تھے، کسی نے فرنیچر دیا، کسی نے مہمانوں کی دعوت کا پورا خرچہ اپنے ذمے لے لیا سائیکل، گھڑی، ریڈیو، برتن، سیونگ مشین، کپڑے، زیور، بجلی کا جملہ سامان۔ حتیٰ کہ وہاں ہر چیز جمع ہو گئی۔

ایک دن شاہ صاحب نے کپل دیو کو بلا کر کہا، "تم ابھی سائیکل پر بانس منڈی

چلے جاؤ۔ وہاں ولایت حسین کی دوکان پر صاحب کے ہاں جانے والا جس قدر سامان بک کرایا گیا ہے ٹھیلوں پر لدوا کر صاحب کے بنگلے پر پہونچا آؤ۔ یہ لو سامان کی فہرست۔ سارا سامان خوب دیکھ بھال کر کے اپنے سامنے وہاں رکھوانا؟ سمجھے! میں نے صاحب سے تمہاری تعریف کر دی ہے اور انہیں کہہ دیا ہے کہ کپل دیو اِس ذمّہ داری کو پوری طرح نبھائے گا۔"

کپل دیو فوراً بانس منڈی پہونچا۔ تین سو کرسیاں اور میزیں تھیں۔ دو بڑے عالیشان شامیانے تھے۔ پانی کے بڑے بڑے ٹب اور دیگر برتن تھے۔ دس ٹھیلوں پر سامان لادا گیا بانس منڈی سے صاحب کا بنگلہ چھ میل دور تھا وہاں تک پہونچنے میں تین گھنٹے لگ گئے ٹھیلے اسی رفتار سے چل سکتے تھے۔ کپل دیو نے دوپہر کا کھانا تین بجے ایک ہوٹل میں کھایا۔ دھوپ اور پسینے سے اس کا جسم نڈھال ہو چکا تھا پھر بھی وہ بنگلے پر شام کے چھ بجے تک سارا سامان ترتیب سے لگواتا رہا۔ وہاں اور بھی بہت سے آدمی کام کاج میں مصروف تھے۔ کبھی کبھی برآمدے میں صاحب کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ انہیں یہ تو جاننے کی فرصت ہی نہ تھی کہ ان کے ہاں کون کام کر رہا ہے۔

ایٹ ہوم کی شام کپل دیو کے لیے بہت ہی اداس ثابت ہوئی۔ وہاں شہر کے بہت سے بڑے افسر مدعو تھے۔ دفتر کے انچارج اور انسپکٹر لوگ بھی تھے لیکن اس نے اپنے آپ کو صد درجہ تنہا اور اُداس محسوس کیا۔ اسوقت اس کے لیے وہاں کوئی کام باقی نہیں رہ گیا تھا۔ شہر کے ایک بڑے ہوٹل کی طرف سے مہمانوں کو کھلانے پلانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہوٹل کے باوردی بیرے مہمانوں کی خدمت کرنے میں مصروف تھے گیٹ پر پولیس کا بینڈ ایک دلنشین مگر بہت ہی اُداس دھن بجا رہا تھا۔ جن دو تین

کلرکوں کے ساتھ وہ بات چیت کرسکتا تھا وہ اس سے کام کرنے میں سبقت لے گئے تھے اور وہ ابھی تک بنگلے کے اندر اور باہر بڑی تیزی سے آ اور جا رہے تھے انہیں کپل دیو کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ کپل دیو وہاں سے چلا آیا۔

دوسرے دن بانس منڈی میں ہر ایک چیز گن کر اور دیکھ بھال کر کے واپس دینی تھی۔ اس کام کے لیے کپل دیو ہی کو بھیجا گیا، وہ کام سے نہیں گھبراتا تھا۔ وہاں اس کی خدمات کو سراہنے والا کوئی نہیں تھا۔ صاحب نے اسے ابھی تک دیکھا بھی نہیں تھا کئی دنوں کے بعد اس کے بدن سے پوری طرح تکان دور ہو سکی۔

ایک دن رام ناتھ نے دورے پر ساتھ لے جانے کے لیے اس کا نام لیا جسے ہیڈ کلرک نے منظور کر لیا۔ رام ناتھ بھی اس کی مانند محض ایک ٹائپسٹ تھا۔ اب اسے رام ناتھ کے ساتھ ایک ماتحت بن کر جانا ہوگا۔ رام ناتھ پہلے درجہ میں سفر کرے گا اور وہ تیسرے درجہ میں۔ اسے ایک شدید صدمے کا احساس ہوا۔ حسد کی آگ تو پہلے سے جل رہی تھی۔ لیکن ساتھ جانے سے وہ انکار نہیں کرسکتا تھا۔

دفتر چھوڑتے وقت رام ناتھ نے اُس کا اپنا سامان اسٹیشن لے جانے کی ذمہ داری بھی اس پر ڈال دی کیونکہ اُسے صاحب کے ساتھ بنگلے پر بہت ضروری کام تھا۔ کپل دیو ایک کڑوا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

رات کو وہ پلیٹ فارم پر اپنے اور رام ناتھ کے سامان کے ساتھ بیٹھا رام ناتھ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا سامان ایک پرانے سوٹ کیس اور دری میں لپٹے ہوئے بستر پر مشتمل تھا لیکن رام ناتھ کے سامان میں ایک اچھا سا چمڑے کا سوٹ کیس، ایک ہولڈال، ایک ٹفن باکس اور لکڑی کے فریم میں رکھی ہوئی ایک صراحی شامل تھی

ایک ٹائپ رائٹر بھی تھا۔

گاڑی آنے میں دس منٹ رہ گئے تھے رام ناتھ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اسے رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ وہ ناحق اس کا سامان اُٹھوا کر لے آیا تھا۔ جانے وہ کہاں بیٹھا گپیں ہانک رہا ہوگا۔ اس نے بوٹ کی نوک سے اس کے چمڑے کے سوٹ کیس کو دبایا، جیسے اس کا پیٹ پھاڑ دینا چاہتا ہو۔

گاڑی آگئی۔ رام ناتھ ابھی تک نہیں پہونچا تھا۔ سامان اُٹھانے والے قلی نے کہا — "چلیے صاحب، سامان گاڑی میں رکھ دوں۔"

اس نے رام ناتھ کے کچھ سامان کو پلیٹ فارم پر ہی چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا اپنا سامان قلی کے سر پر رکھ دیا۔ چمڑے کا سوٹ کیس اور صراحی وہیں پڑی رہنے دی قلی نے کہا — "آپ اس سامان کو دیکھیے گا۔ میں یہ سامان گاڑی میں رکھ آؤں۔

کپل دیو قلی کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ پلیٹ فارم پر چمڑے کا سوٹ کیس اور صراحی پڑی رہی — قلی نے پوچھا: "آپ وہاں رکے نہیں تھے؟

"ہاں، تم چلو، کون اُٹھائے گا؟"

"یہ سامان کس درجے میں رکھا جائے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا، کہاں رکھا جائے؟ رام ناتھ پہلے درجے میں سوا ہوگا۔ اور وہ تیسرے درجے میں۔ یہاں سے لے کر بنارس تک۔ بنارس پہونچ کر رام ناتھ انسپکٹروں کے ریسٹ ہاؤس میں قیام کرے گا اور وہ ماتحت کلرکوں کی جگہ جہاں ایک چھوٹی سی جھونپڑی جیسی بھی نہیں ہوگی۔ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں پڑے رہنا ہوگا۔

اس نے سر گھما کر پلیٹ فارم پر اس جگہ کی طرف دیکھا جہاں وہ رام ناتھ کا کچھ

سامان چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ سامان ابھی تک رکھا تھا اور دور سے اُسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کپل دیو کی نیت سمجھ گیا ہو۔ کپل دیو سوچ رہا تھا سامان کو ابھی تک کسی نے اُٹھایا نہیں اُٹھانے والے تو پلک جھپکنے کی دیر میں اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس وقت کوئی اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ اُس نے قلی سے کہا: صاحب کا سامان پہلے درجہ میں لگا دو۔"

"اور آپ کا؟"

"ابھی یہاں باہر رکھو!"

قلی نے ویسا ہی کیا، وہ بھاگ کر سوٹ کیس اور صراحی بھی اُٹھا لایا۔ برتھ پر بستر بھی کھول دیا اور پھر نیچے اُتر کر کپل دیو کے سامنے آکھڑا ہوا۔ بولا۔

"مجھے مزدوری دیدیجیے۔"

قلی کو وہ رام ناتھ کے سامان کی مزدوری دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے قلی کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ لیکن جب وہ گڑگڑایا تو اس نے اسے چار آنے دیدیے۔ وہ چار آنے پاکر خوش نہ ہوا، کہہ سُن کر دو آنے اور بھی لے گیا۔

گاڑی کھلنے سے دومنٹ پہلے رام ناتھ پہونچا۔ بغل میں فائل دبائے اور بڑے اطمینان سے سگرٹ پیتا ہوا، پوچھا: "سامان رکھ دیا؟ گڈ، اچھا اب، تم جا کر اپنے ڈبے میں بیٹھو ورنہ جگہ نہیں ملے گی۔"

کپل دیو نے کوئی جواب نہ دیا۔ رام ناتھ گاڑی کے ڈبے میں گھس کر اپنے سامان کا جائزہ لینے لگا۔ کوٹ اُتار کر لٹکاتے ہوئے بولا ـــــ "تم اب جا کر بیٹھو بھئی! گاڑی تو کھلنے والی ہے۔"

کپل دیو کہیں جاکر بیٹھنے کی بجائے وہیں کھڑا اُسے گھورتا رہا۔ رام ناتھ بہت حیران ہوا! کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا: "کیا ہوا بھئی، تم جاکر بیٹھتے کیوں نہیں؟"

کپل دیو نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں جواب دیا: "میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ میری طبیعت خراب ہورہی ہے۔"

رام ناتھ کو تعجب ہوا "طبیعت خراب ہورہی ہے! کیوں؟ پہلے پتہ نہیں تھا، خیر تم گاڑی میں بیٹھو۔ کل بنارس پہونچکر کوئی دوا لے لینا۔"

"جی نہیں، میں ساتھ چلنے سے بالکل مجبور ہوں۔"

گاڑی نے سیٹی بجادی۔

"ارے بھئی وہاں جاکر کس سے ٹائپ کا کام کراؤں گا۔ بیٹھو۔ بیٹھو، بنارس پہونچکر کسی ڈاکٹر سے دوا لے لینا۔ گھبراؤ مت!"

"جی نہیں!"

"تم بہت عجیب ہو!"

گاڑی چل دی۔ رام ناتھ سخت تذبذب میں تھا۔ جلدی سے اونچی آواز میں بولا "کل صبح دفتر جاکر کوئی دوسرا ٹائپسٹ بھجوادینا میں وہاں انتظار کروں گا، سمجھے! بھولنا نہیں!"

گاڑی دھڑدھڑاتی ہوئی پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ کپل دیو نے ایک ہاتھ میں اپنا پرانا زنگ آلود لوہے کا بکس اور دوسرے میں دری میں لپٹا ہوا بستر اُٹھاکر باہر کا رُخ کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

چمار

۱۹۵۸ء

رام چندر لکڑی کے بند اسٹال کے سامنے کئی چکر لگا چکا تھا۔" جانے آج بڑھا کہاں مرگیا ہے؟" اُسے رہ رہ کر غصّہ آتا۔ اسٹال کی چھت پر پڑی ہوئی پرانی جوتیوں کے ڈھیر کو گھورتا جو بارش اور دھوپ میں پڑی پڑی سیاہ ہو چکی تھیں اور پھر پتلون کی جیب میں پڑی ہوئی شراب کی خالی بوتل کو انگلیوں سے ٹٹول کر بڑبڑاتا — وہ ضرور کسی کے ہاں نیا جوتا پہنچانے گیا ہوگا۔ وہ اسقدر بیوقوف ہے کہ اتنا اچھا کاریگر ہو کر بھی ضرور تمندوں کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ دراصل وہ تعریف کا بھوکا ہے۔ گاہکوں سے تعریف کے دو بول سُن کر اپنی مزدوری کم کر دیتا ہے!

رام چندر زیر لب بڑبڑاتا ہوا بس اسٹینڈ کی طرف چلا گیا۔ بس اسٹینڈ چار باغ ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہے۔ وہاں ہر وقت بسیں کھڑی رہتی ہیں۔ جتنی جاتی ہیں اُس سے زیادہ آ جاتی ہیں۔ بارش کی وجہ سے ٹائم کیپر اور مکینک نے اپنا دفتر ایک بس کے اندر بنا لیا تھا۔ پانی اور کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک پر رام چندر کو خاکی پتلون کے پائنچے گھٹنوں تک اوپر چڑھا کر آتے ہوئے دیکھا تو ٹائم کیپر نے کھڑکی سے پان کی پیک تھوکتے ہوئے کہا — "سالے! آج بھی پیے ہے کیا؟"

ادھر وہ کافی عرصہ سے ہر روز پی رہا تھا۔ وہ بھی اِن کا ساتھی تھا۔ بس کنڈکٹر۔ نئے اور پُرانے پیسوں کی تبدیلی سے اُسے روزانہ دو ڈھائی روپے بچ جاتے تھے

کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ۔ جبتؔ پکڑے جانے کے خوف کو بھول کر بغیر بکنگ کے مسافرلے جاتا تھا۔ سیاہ چمکدار رنگ، موٹی اور چھوٹی ناک، بھرے بھرے ہونٹ تنگ پیشانی اور پیچھے کی طرف جمائے ہوئے سیاہ روکھے بال۔ آج صبح اس کی بوڑھی ماں مرگئی تھی، جسے وہ دن میں دوپہر کے وقت شمشان میں جلا آیا تھا۔ تب سے وہ گھر واپس نہیں گیا تھا۔ گھر میں اب اُس کے لیے تھا ہی کون؟ ماں کی موت کا غم بھلانے کے لیے بھی اُسنے تھوڑی سی پی لی تھی۔

وہ ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ بھی بس اسٹیشن پر چلا جاتا تھا۔ ساتھیوں کے ساتھ بیہودہ مذاق کرنے، بیڑی کے کش لگانے، پیک تھوکنے اور مسافر عورتوں کو دیکھ دیکھ کر جی ٹھنڈا کرنے!

"ابے چمار! اپنی اوقات کو بھول گیا؟ ذرا دور ہٹ کر بیٹھ!"

"دیکھ اُدھر تیری ماں آرہی ہے تیرے لیے چار چکر کاٹ چکی ہے"

"اِسکی شکل دیکھ کر تو مجھے راون یاد آجاتا ہے"

"سالا کہا کرتا تھا۔ میں ایک پیسہ حرام نہیں کھاؤں گا! اب کوئی دیکھے اِسے ہر روز کتنے روپوں کے نئے پیسے بھر کرلے جاتا ہے"

"چمار کے قول وفعل کا اعتبار کیا!"

اتنی ساری بیہودہ باتوں میں صرف ایک بات اُس کے دل کو کھا جاتی۔ صرف ایک لفظ اُس کے سینے میں تیز نیزے کی طرح گڑ کر رہ جاتا۔ چمار! وہ بھلے ہی چمار تھا لیکن جب لوگ اُس کے تئیں اپنی حقارت کا اظہار اِس طرح کرتے تو اُس کا خون کھول جاتا۔ جی چاہتا، کہنے والے کے اوپر کود جائے اور اُس کی گردن دبادے۔ لیکن

دوسرے ہی لمحہ وہ یہ سوچ کر خود کو روک لیتا۔ یہ سالے خود چمار ہیں، ایک دن ان سے ایسا بدلہ لوں گا کہ ساری عمر یاد کریں گے ۔۔!

یہ سچ تھا لباس اور شکل وصورت میں وہ رام چندر سے کسی طرح بھی برتر نہیں تھے بلکہ کسی کسی سے تو رام چندر زیادہ اچھا نظر آتا تھا لیکن اِسے کیا کیا جائے کہ وہ قوم کے چمار نہیں تھے جبکہ رام چندر تھا اور یہ بات سب ساتھیوں کو معلوم ہوگئی تھی۔ اُس کے ساتھی تو مسافروں کے سامنے بھی اِس بات کا اعلان کر دیا کرتے تھے۔ ایک بار ایک مسافر نے اُس کے ہاتھ سے ٹکٹ لینے سے انکار کر دیا تھا اور یہ کہہ کر بس سے اُتر کر یکّے میں جا بیٹھا تھا۔۔ "کانگریس حکومت نے تو حد کر دی!"

چار باغ کے بس اسٹیشن پر وہ تنہا تھا۔ اُس کی قوم کے کئی ساتھی جو اُس کے ساتھ بھرتی ہوئے تھے شہر میں دوسرے اسٹیشنوں پر کام کرتے تھے۔ اس کو تنہائی کا احساس اُسوقت واقعی شدید ہوتا جب وہ ساتھیوں اور مسافروں کے درمیان ایک کنڈکٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک چمار کے طور پر کھڑا ہوتا۔ بغل میں لٹکے ہوئے چرمی بیگ کو سختی سے دبائے، ہونٹ بھینچے، اور بڑی بڑی آنکھوں سے خلا، میں گھورتا ہوا! انتہائی مایوسی کا شکار ہوکر وہ یہ بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ وہ چمار ہی رہتا تو کیا بُرا تھا۔ تب وہ کسی کو دھوکا تو نہیں دیتا تھا اُسوقت اُس کے دل میں اِس بات کا کوئی رنج نہیں ہوتا کہ وہ چمار کیوں تھا! تعلیم اور سرکاری نوکری حاصل کرکے تو اُس نے اپنے لیے خاصی مصیبت مول لے لی تھی۔ آج اُس کی ماں کی ارتھی کے ساتھ جانے والوں میں اُس کا ایک بھی ساتھی نہیں تھا، سب کے سب چمار تھے۔ اڑوس پڑوس کے۔ اور دُور دُور کے جنہیں وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ کبھی اُن کے ساتھ بات تک نہیں کی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک ٹائم کیپر کے گلے کے زیر اثر بس کے گیٹ پر ہینڈل تھامے کھڑا رہا۔ اس کی نگاہیں اگرچہ ٹائم کیپر کے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے چہرے پر جمی تھیں لیکن اس کا دل کہیں اور تھا۔ زخمی، چوٹ کھایا ہوا، چند گھونٹ اور شراب کی خواہش کے لیے ترستا ہوا! شراب اُسے سب کچھ بھلا دیتی تھی۔ شراب پی کر تو وہ ٹھوکر بھی لگا سکتا تھا۔ ٹھوکر اُس کی سب سے بڑی آرزو بن چکی تھی۔ جس ٹائم کیپر کے سامنے وہ ڈیوٹی کے اوقات کی تبدیلی کے لیے گڑگڑاتا تھا اُس کے سَر کو وہ اپنے بوٹ کی ٹھوکر سے توڑ ڈالنے کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ ٹائم کیپر کو کوئی جواب دیے بغیر وہ بس اسٹینڈ سے چلا آیا۔ اِدھر اُدھر کسی مسافر عورت کی طرف بھی نہیں تاکا۔ سر جھکائے، سوچتا ہوا، پتلون کی جیب میں خالی بوتل پر سختی سے اُنگلیاں جمائے۔ اچانک اُس کا راستہ رگھوناتھ نے روک لیا یہ کہہ کر—
"ابے نشے میں دُھت ہے کیا؟"

اُس نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ سر اُٹھا کر اُسے گھورا۔

"ارے سُن! تجھے معلوم ہے مجھ پر بغیر ٹکٹ مسافر لے جانے کا کیس ہو گیا ہے؟"
رگھوناتھ نے بیڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا سچ —!" وہ جیسے خوش ہو اُٹھا۔

"ہاں آج ہی صبح اُس کانے انسپکٹر نے جو کالا چشمہ لگائے رہتا ہے۔ تے فیر کے سامنے بس روک کر چیکنگ کر لی۔ دو مسافر پکڑ لیے۔ ایک تو کونسل ہاؤس کا چپراسی تھا جس سے میں ابھی ایک کانگرسی سجن کی سفارش سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ میرے حق میں بیان دیگا۔ دوسرا آدمی یونیورسٹی کے ایک ہوسٹل کا کوئی چمار ہے شاید! اس کا پورا پتہ لگا لوں پھر تیری ضرورت پڑے گی۔ میرا یہ کام تو کر ا ہی

دے گا نا! کیوں!"

یہی رگھوناتھ تھا جس نے ایک میز پر اُس کے ساتھ کبھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ یہی وہ تھا جو دور سے اُسے دیکھ کر" چمار آرہا ہے راستہ چھوڑ دو" کی آوازیں لگانا شروع کر دیتا تھا۔ اِسے چڑانے کے لیے اُس کے چھوئے ہوئے بس کے ہینڈل تک صاف کرانے لگتا تھا۔

رام چندر نے اُسے ایک غلیظ گالی دیکر کہا —"آج ہی تو آیا ہے تو چماروں کے ہاتھ میں! میں دیکھوں گا تو بچ کر کیسے جاتا ہے۔!"

وہ رگھوناتھ کی کوئی بات سُنے بغیر چار باغ کے پارک میں چلا گیا۔ جس میں گاندھی جی کا ایک مجسمہ سیمنٹ کے اونچے پلیٹ فارم پر نصب تھا۔ مجسمے کے اوپر ایک چوڑی چھت تھی وہاں بارش کی ایک بوند نہیں پڑ سکتی تھی۔ وہ بھیگے ہوئے کپڑوں اور کیچڑ سے لت پت بوٹوں سمیت مجسمے کے پلیٹ فارم کے ساتھ کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ گاندھی جی کا مجسمہ اُس کے سر کے عین اوپر تھا۔ بائیں طرف درختوں کے جھنڈ کے اوپر بجلی کا بڑا کلاک نظر آتا تھا آٹھ بجنے میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے۔ اُس نے سوچا وہ آٹھ بجے یہاں سے چل دے گا اُس بڈھے موچی سے ملنے کی ایک اور کوشش کرے گا۔

ڈیڑھ سال پہلے وہ ٹوٹے ہوئے جوتے کی وجہ سے بس کے فٹ بورڈ سے پھسل گیا تھا۔ کچھ چوٹ بھی لگی تھی، گھٹنے اور بازو کی کہنی چھل گئی تھی۔ اُس کی جیب میں زیادہ پیسے بھی نہیں تھے، صرف دو آنے۔ وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا۔ کسی موچی کی دُکان پوچھتے پوچھتے اس بڈھے کے پاس آ بیٹھا تھا جو پٹرول پمپ کے سامنے ایک ننھا لکڑی کے اسٹال میں چمڑے کی بے شمار کترنوں، لکڑی کے سانچوں

چمار

اور ادھ سلے نئے جوتوں کے درمیان تیز چمکتی ہوئی رانپی سے ایک چمڑے کا ٹکڑا کاٹ رہا تھا۔ سیاہ سڑا ہوا کمزور بدن جو کام کی لگن میں بالکل دہرا ہو جاتا تھا، وہ اصل میں بہت لمبا تھا۔

"اس جوتے کا تلہ اُکھڑ گیا ہے، چھ سات کیلیں جڑ دو ذرا جلدی سے!" رام چندر نے جوتا پاؤں سے اُتار کر اُس کے قریب رکھ دیا اور اپنی جیب میں پڑے ہوئے دو آنے ٹٹولنے لگا۔

بوڑھے موچی نے پرانے گھسے ہوئے جوتے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر رام چندر کے خاکی کپڑوں کی طرف، پھر اُس کے چہرے کی طرف اور پھر مسکرا کر کہنے لگا — "اس میں سلائی ہو گی، تلہ نیا لگے گا۔ ایڑی بھی بالکل گھس گئی ہے! ذرا دوسرا جوتا بھی اُتاریئے۔"

"نہیں بھئی، یہ سب نہیں کرانا ہے۔ صرف اس پر کیلیں لگا دو۔" اُس نے جیب سے ایک اکنی نکال کر اس کے سامنے پھینک دی، جو پتھر کی سل سے اُچھل کر ایک جوتے کے اندر جا پڑی۔

بوڑھے نے اس جوتے کا پھر سے جائزہ لیا اور پھر جیسے ذہنی اذیت میں مبتلا ہو کر کہا — "میری رائے یہی ہے کہ جوتے کی پوری مرمت کرا لیجئے، اس سے جوتا تباہ ہونے سے بچ جائے گا۔"

"بات اصل میں یہ ہے" رام چندر اُس کے پاس پڑی ہوئی زنگ آلود لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر بولا — "میرے پاس صرف دو آنے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اپنی بس کے فٹ بورڈ سے پھسل گیا۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ بچ گیا ورنہ لوگ کہتے تھے کہ تم موت کے بالکل قریب پہونچ گئے تھے!"

بوڑھے موچی نے ایک طرف رکھا ہوا بیڑی کا بنڈل اور ماچس اُٹھائی اور لکڑی کی دیوار کے ساتھ کمر لگا کر پوچھا۔

"آپ بس کنڈکٹر ہیں شاید!"

رام چندر نے اثبات میں سر ہلا کر اُسے گھورا۔

"بیڑی پیجئے ——"

اُس نے ایک بیڑی لے لی اور اُس کے ہاتھ سے جلتی ہوئی سلائی بھی۔ ایک کش زور سے کھینچ کر کھانسنے لگا۔

"تنخواہ میں سے کچھ بچتا وچتا نہیں ورنہ میں نیا بوٹ خرید لیتا۔"

بوڑھے نے اُسکی بات بڑے دھیان سے سُنی۔ اُسے سر سے لیکر پاؤں تک پھر گھورا۔ اور بیڑی کی بجھی ہوئی راکھ کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پہ گراتے ہوے کہا۔

"ابھی نئے آئے ہیں شاید!"

"ہاں دو ایک مہینے ہو گئے ہیں"

"کہاں رہتے ہیں؟"

"اُدھر غوث آباد میں ایک کمرہ مل گیا ہے اتفاق سے"

"بہت دور ہے گوس آباد تو"

"ہاں ہے تو! یہاں سے وہاں تک روزانہ پیدل آنا جانا پڑتا ہے"

"اُدھر کوئی بس بھی نہیں جاتی"؟

"نہیں"

بیڑی ختم کر کے بوڑھے نے اُس کے جوتے کو پھر ہاتھ میں لیا۔ اُسے ایک بار پھر

اُلٹ پلٹ کر دیکھا پھر جلدی جلدی ایک مضبوط چمڑے کا ٹکڑا کھینچ کر اس کا نیا تلہ اور ایڑی کاٹنے لگا۔ رام چندر پہلے تو چپ چاپ دیکھتا رہا جب وہ اُسی کے جوتے پر نیا تلہ جوڑنے لگا تو وہ بول پڑا ــــ

"میں نے اس پر صرف کیلیں لگانے کے لیے کہا تھا۔"

بوڑھے نے اُسے یوں ذرا سی گردن گھما کر گھورا اور آنکھوں میں ایک شوخ تبسم پیدا کر کے بولا ــــ

"جب پیسے ہوں دے جانا میں مانگوں گا نہیں۔"

"لیکن تم مجھے ــ۔"

"ہاں آپ کو میں نہیں جانتا۔ آپ پتہ نہیں کیسے ہیں۔ شاید میری مزدوری مار کر بیٹھ جائیں! آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا! میں یہ سب نہیں سوچتا۔ میں کاریگر ہوں۔ اپنے کام اور محنت سے مجھے پیار ہے۔ میری مزدوری مجھے ہمیشہ مل جاتی ہے۔ ہفتے بعد، دو مہینے بعد، سال بعد، کبھی نہ کبھی!"

اُس نے رام چندر کے دونوں جوتے مرمت کر دیے۔ نئے سول، نئی ایڑیوں اور چمکتی ہوئی پالش سے وہ بالکل نئے ہو گئے۔ رام چندر بوڑھے موچی کے اخلاق سے اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ اُس کے اندر اُس کا شکریہ ادا کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ روزانہ اُس کے پاس جانے لگا۔ ڈیوٹی کے اوقات کے بعد دو دو گھنٹے اُسکے پاس بیٹھ کے باتیں کرتا، باتیں سُنتا۔ باتیں جو بیہودہ مذاق، گالیوں اور حقارت اور جھوٹ سے پاک ہوتی تھیں۔ بس اسٹیشن کی دلشکن فضا سے باہر۔ یہی بڈھا موچی اس کا حقیقی دوست بن گیا۔ بڈھے کو وہ کبھی کچھ نہ دے سکا۔ اُس نے رام چندر کو نہ صرف قلبی راحت اور

سکون بخشا بلکہ ایک باپ جیسی شفقت بھی دی۔ نئے نئے بوٹ بھی دیے جن کی قیمت اس نے کبھی نہیں لی۔ یہ بات اگرچہ ایک کاریگر کے خلوص کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کے مترادف تھی لیکن وہ کیا کرتا! بوڑھا اس کی بات ہی نہیں سنتا تھا۔ بلکہ وہ اپنی جیب سے اسکی ہمیشہ کچھ نہ کچھ مدد کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ ایک بار وہ بیمار پڑا تو اپنی دکان بند کرکے وہ اُس کے پاس کئی روز تک آکر رہتا رہا۔ دوا دارو کا خرچ بھی خود اپنی جیب سے دیا لیکن اس کی شفقتوں اور ایثار سے رام چندر آہستہ آہستہ اوب گیا۔ وہ بوڑھے موچی کو بیوقوف سمجھنے لگا۔ اُس کے پاس جانا کم کردیا۔ شراب پینے اور جوا کھیلنے کی عادت نے اُسے اور دوست دیدیے۔ وہ بڈھے کو سامنے آتا دیکھ کر منھ پھیر لیتا تھا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں رام چندر نے جو اپنے طبقے کی گھٹی ہوئی زندگی سے بھاگ کر یہاں ایک آدرش زندگی بسر کرنے کا ارادہ لے کر آیا تھا، ایسے طور طریقے سیکھ لیے تھے جو اُس کے طبقے کا خاص نشان تھے۔ خاص پہچان تھے۔ زیادہ محنت، کم تنخواہ، بے ایمانی، بدزبانی، مایوسی، خوف، شراب، گالیاں، قہقہے اور وہی روزمرّہ کولھو کے بیل جیسا گھسا پٹا معمول — اور آج وہ مہاتما گاندھی کے مجسمے کے سائے میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا، آٹھ بجیں تو وہ بوڑھے موچی کے پاس جاکر ایک نیا جوتا اُدھار مانگے۔ جسے بازار میں ایک دوسرے لوچی کے پاس بیچ کر تھوڑی سی شراب خرید لے۔ وہ گھر جانے سے ڈرتا تھا۔ اکیلے گھر میں۔ شراب پی کر وہ دندناتا ہوا گھر میں گھس سکے گا۔

اسٹیشن کے کلاک نے دس بجائے تو وہ چونک پڑا۔ جلدی سے اُٹھا۔ ابھی تک بوندا باندی جاری تھی۔ اُس نے قمیص، پتلون سے باہر نکال لی اور آہستہ آہستہ پیٹرول پمپ کی طرف چلا۔ دور سے دیکھا بوڑھا بھی اُسی وقت لوٹا تھا اسٹال کا تالا کھول

رہا تھا۔ اونچے کمزور جسم پر صرف ایک دھوتی باندھے۔ منڈا ہوا سر اور ایک پتلی لمبی چوٹی جو اس کی گردن کی پشت پر ہمیشہ کھلی رہتی تھی۔ رام چندر نے پاؤں میں پہنا ہوا پرانا جوتا پٹرول پمپ کی دیوار کے پیچھے پھینک دیا اور لپک کر اُس کے سامنے جا پہنچا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مسکرایا۔ جھجکا اور پوچھا: "مجھے پہچانا!"

"ہاں" بوڑھے نے کرخت لہجے میں جواب دیا۔ اُسے ایک گہری نظر سے دیکھا پھر تالا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

"میرے سر پر دس جوتے ماریے" رام چندر اس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا بوڑھا تالا کھولتے کھولتے لوٹ آیا وہ کسی قدر لنگڑا رہا تھا اس کے ٹخنے پر پٹی بندھی ہوئی تھی وہ اُس کے پاس اونچے درخت کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا اور پہلے سے زیادہ ترش و تیز لہجہ میں پوچھا۔

"کیا کہا؟"

"میرے سر پر دس جوتے ماریے" رامچندر کی آواز پہلے سے زیادہ نحیف ہو گئی۔

"کیوں؟"

"میں گناہگار ہوں!"

"وہ کیسے؟"

"آپ جیسے مہربان کے پاس، جس نے مجھ پر بے شمار احسان کیے، مجھے کتنی بار بغیر قیمت لیے نئے نئے جوتے بنا کر دیے، میری بیماری میں روپے پیسے سے میری مدد کی، میں ایک عرصہ تک نہیں آیا۔ یہ میرا گناہ نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا آپ مجھے معاف کر سکیں گے؟"

اچانک بوڑھے موچی نے اُسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اسکی گردن کو زور سے ایک

جھٹکا دے کر اوپر اُٹھایا۔ جھک کر رام چندر کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا ـــــ" یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم وہ سب کچھ نہیں بھولے۔ ورنہ بہت سے لوگ تو مجھے پہچانتے بھی نہیں۔ ابھی ابھی کئی دروازے کھٹکھٹا کر لوٹا ہوں۔ جن لوگوں کو میں نے اپنی کڑی محنت اور پسینے کے تحفے پیش کیے تھے اُنھوں نے میری بات سننے سے بھی انکار کر دیا لیکن مجھے یقین ہے تم ایسا نہیں کروگے، اگر کروگے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا ابھی، اسی وقت، اسی جگہ! نکالو میرے روپے، میری محنتوں کا معاوضہ! میں اپنے احسان واپس لیتا ہوں۔ احسانوں پر سے میرا وشواس اُٹھ گیا ہے۔ اِس زمانہ میں احسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ لاؤ، نکالو، جو کچھ تمہارے پاس ہے، مجھے پاؤں کے پھوڑے کا علاج کرانا ہے۔ میرا پاؤں روز بروز گلتا جارہا ہے۔ درد کے مارے میں کام بھی نہیں کر سکتا۔"

رام چندر کی جیسے ساری ادی ہستی گم ہوگئی اُس کا سانس جہاں تھا وہیں رُک گیا تھا۔ بڑی مشکل سے حواس مجتمع کیے اور زور لگا کر اپنا گریبان چھڑایا اور وہاں سے بھاگ گیا، ننگے پاؤں۔ کیچڑ اور پانی کے چھینٹے اُڑاتا ہوا۔ شراب کی خالی بوتل اُس کی جیب سے نکل کر راستے میں کہیں گر گئی۔ ایک تاریک گلی میں جو اسٹال اور سڑک سے تھوڑی دور تھی، وہ رُک کر ہانپنے لگا۔ بارش سے بچنے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اچانک اُس کے پاس، بالکل قریب ایک سایہ اُبھرا۔ اس کی سفید چمکتی ہوئی آنکھوں سے اندازہ ہوا کہ کوئی عورت تھی۔ اُس عورت نے اُس کے بازو کو چھوا اور پھر فوراً ہی اُس کی ایک باریک، تیز نقرئی ہنسی فضا میں بکھر گئی۔

"بڈھا تمہاری جان لینا چاہتا تھا؟ عورت نے پوچھا۔

"ہاں" وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ "میرا تو دم گھٹنے لگا تھا۔"

وہ پھر ہنس دی: "لیکن وہ تمہاری جان نہیں لے سکتا۔ اُسکی انگلیوں میں اتنی طاقت کہاں ہے! میں اُسے جانتی ہوں۔"

"تم اُسے جانتی ہو؟ تم کون ہو؟"

"میں اُسکی بیٹی ہوں۔"

"اُسکی بیٹی؟" "جھوٹ، میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں اُسکی کوئی اولاد نہیں ہے۔"

"یقین کرو وہ میرا باپ ہے۔ وہ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ پچھلے چار سال سے وہ میری جان لینا چاہتا ہے۔ میں جب بھی اُسکے سامنے جاتی ہوں مجھے ایک لفظ نہیں کہہ پاتا۔ سر جھکا لیتا ہے بس!"

رام چندر پھر بُت بنا کھڑا تھا۔ اُس عورت نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"اُدھر چلے چلو۔ سامنے پہرہ دینے والے چلے آرہے ہیں۔ اُنکی سیٹی کی آواز سن کر میرا سارا جسم کانپ جاتا ہے، تمہارے ساتھ مجھے دیکھ لیا تو پھر دونوں کی خیر نہیں ہوگی۔"

"کیوں؟ تم اِن سے کیوں ڈرتی ہو؟ تم کون ہو؟"

"میں؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "میں لکھمنیا ہوں۔ آؤ اِدھر لکشمی اسٹور کے برآمدے میں بیٹھیں گے۔ وہاں اندھیرا ہے۔"

لکشمی اسٹور کے برآمدے میں سیمنٹ کے فرش پر دونوں بیٹھ گئے۔ لکھمنیا اُس کے قریب سرک گئی۔ اُسکے گیلے بالوں کو چھو کر بولی: "اُف کتنے ٹھنڈے ہیں تمہارے بال! معلوم ہوتا ہے بہت دیر سے بھیگتے پھرتے ہو!"

اُس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے سر کے بال پونچھے اور پوچھا۔

"بڈھا تمہارا دوست تھا نا!"

رامچندر کو لکھمنیا کے جسم میں کچھ حرارت محسوس ہوئی اُس کا جسم بہت نرم تھا۔ وہ تھوڑا اور اسکے قریب سٹ کر بیٹھ گیا۔ لکھمنیا نے اپنا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دیدیا، اور بولی۔

"تمہیں سردی لگ رہی ہے"! یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اُسکے سینے کے ساتھ اپنا سر ٹکا دیا ـــــ رام چندر کی ناک میں اُس کے بالوں کی عجیب سی مہک گھس گئی کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے کو بہت ہی والہانہ طور پر چومتے رہے۔ رام چندر نے سوچا اِس وقت اُسے ایک عُورت کی ہی ضرورت تھی۔ لکھمنیا اس بوڑھے موچی کی بیٹی تھی۔ یہ انکشاف اسکے لیے بہت حیرتناک تھا۔ لیکن اس کے دل سے بڈھے کے خلاف سارا غصہ ختم ہو گیا۔ اسی پیار محبت کی کیفیت میں اُس نے لکھمنیا کو بتانا شروع کیا ـــــ

"میرے ساتھی بہت کمینے ہیں، اُن لوگوں نے میرے ساتھ ہمیشہ بُرا سلوک کیا ہے مجھے میرے منہ پر چمار کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان سے بھاگ کر میں تمہارے باپ کے پاس آتا تھا اس کے پاس آکر مجھے بہت خوشی ہوتی تھی۔ لگتا تھا وہ میرا حقیقی باپ ہے لیکن آج ـــ میں بھی کس قدر کمینہ ثابت ہوا۔ آج اُسی کو دھوکا دینے کی کوشش کی۔ اُف! میں کتنا ذلیل ہوں۔ میں کتنا گر گیا ہوں۔ اُسی کو فریب دینے کی کوشش کی جو میرا سب سے بڑا محسن ہے۔"

لکھمنیا نے اُسے اور کچھ نہ کہنے دیا۔ بولی: "یہ بہت عجیب دُنیا ہے۔ کچھ لوگ اپنے کو چمار کہلانے سے شرماتے ہیں اور کچھ پنڈت کہلانے سے۔ میرا باپ پنڈت ہے۔ لیکن وہ کسی کو یہ بات نہیں بتاتا۔ کیونکہ وہ پچھلے سات سالوں سے فٹ پاتھ پر بیٹھا جوتیاں گانٹھ رہا ہے۔ اور اُسے اس بات کی بہت شرم لگتی ہے۔"

رام چندر کے لیے یہ انکشاف بھی نیا تھا۔ بوڑھا موچی اصل میں ذات کا براہمن تھا!
اُس نے کہا "لیکن تمہارا باپ کتنا اچھا ہے۔ مجھے معاف کر دے تو میں اس کے ساتھ اسٹال پر رہنا شروع کر دوں گا۔ گھر پر میں اکیلا ہوں۔ وہاں میرا جی نہیں لگتا۔ میری ماں آج ہی مری ہے۔ میں اپنا سامان اُٹھا کر یہاں لے آؤں گا۔"

لکھمنیا خاموش ہو گئی۔ کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ رام چندر نے اُس کے بازو پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا "کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ کچھ جھجکتی ہوئی بولی "میرے باپ نے مجھے فٹ پاتھ کے اِس اسٹال کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں دی تھی۔ فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی چیز کا کوئی بھی مالک بن سکتا ہے، جو پہلے ہاتھ میں اُٹھا لے۔ تمہارا گھر اِس جگہ سے اچھا ہے۔ تم وہیں رہو تو اچھا ہے۔"

"میرا گھر اچھا ہے؟"

"ہاں۔"

"تم وہاں رہو گی میرے ساتھ۔"

لکھمنیا نے کوئی جواب نہ دیا، وہ اُسکے اور قریب ہو گئی۔ کچھ لمحوں تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اچانک لکھمنیا سسک کر بولی "میں سڑکوں پر ماری ماری پھر پھر کر تھک گئی ہوں۔"

صبح چار بجے اور ذرا روشنی پھیلی تو دونوں پان والے کے تختے سے اُتر آئے۔ اُجالے میں دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پیار سے دیکھا۔ لکھمنیا درمیانے قد کی سانولے رنگ کی معمولی نقش و نگار کی عورت تھی۔ چوڑا فراخ ماتھا۔ بڑی بڑی اُداس آنکھیں جن میں اس وقت اُمید کے دیے جھلملا رہے تھے اور کسی قدر مڑی ہوئی ناک! کمزور، زرد مگر شادماں چہرہ! رام چندر اُسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ اُسے وہ پہلے کبھی کبھی بس اسٹینڈ پر دیکھ چکا تھا لیکن اس کی طرف خاص

توجہ نہیں دی تھی۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے اسٹال کی طرف چلے۔

بارش تھم چکی تھی۔ سڑک ابھی گیلی تھی۔ اخباروں اور دودھ سے بھری ہوئی موٹریں فرّاٹے بھرتی ہوئی گذر رہی تھیں۔ بوڑھا موچی اسٹال کے نیچے ٹاٹ پر لیٹا کھانس رہا تھا۔ وہ دونوں اس کے پاس جا بیٹھے۔ سر جھکا کر اسٹال کے نیچے جھانکنے لگے۔

"باہر آجایئے —— صبح ہوگئی ہے۔"

"تم پھر آگئے ہو؟" بڈھے نے اُسے گھور کر دیکھا۔

"ہاں — میرے ساتھ لکھمنیا بھی آئی ہے۔ اسے پہچانتے ہیں نا!"

دونوں ہنس پڑے۔ بڈھا خاموشی میں ڈوب گیا۔ کھانسنا بھی بھول گیا۔

رام چندر نے اُسے پھر بلایا —" میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میں آپ کی بیٹی کے ساتھ شادی کروں گا۔ اسے اپنے گھر لے جاؤنگا۔ ہمیں آشیرواد دیجئے گا نا!"

"میری بیٹی!" وہ غرّا اُٹھا۔ سرک کر باہر آیا۔ ان کے سامنے پاؤں کے بل بیٹھے بیٹھے دونوں کو چند لمحوں تک گھورتا رہا۔ پھر بولا۔

"میں براہمن ہوں۔ براہمن کی بیٹی ایک چمار کی بیوی نہیں ہوسکتی۔" یہ کہہ کر وہ بہت بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اس وقت تک لکھمنیا جو خاموش بیٹھی تھی بول اُٹھی —"کئی چماروں کے ساتھ رہنے سے تو اچھا ہے کہ صرف ایک ہی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رہنے لگوں۔"

بوڑھا تب بھی بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر اچانک لوٹا اُٹھا کر بجلی کے لیمپ کے عقب والے میدان میں کچھ کہے سُنے بغیر چلا گیا۔

سُورج، چاند، سِتارے

۱۹۵۶ء

چھ بج گئے تھے۔

سڑک پر دفتروں سے لوٹنے والوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ سڑک لال باغ کو دھارا سبھا مارگ سے ملاتی تھی۔ اس پر کچہری، میونسپلٹی ریلوے کے ڈویزنل آفس اور جنرل پوسٹ آفس سے لوٹنے والے کلرکوں کی بھیڑ رہتی تھی۔

گائیتری روزمرہ کی طرح بالکونی میں کرسی ڈالے سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ دن بھر اُس نے اپنے شوہر کا سوئٹر بنا تھا۔ جس کے بازو ابھی تک مکمل نہیں ہوئے تھے شام کے پانچ بجتے ہی بالکونی میں بیٹھ جانا اُس کی عادت بن چکی تھی۔ جب اُس کا شوہر لوٹتا تو وہ دور سے ہاتھ لہرا کر اُس کا سواگت کرتی پھر سیڑھی کے دروازے پر اُس کا محبت بھرا ہاتھ، گرم کلر نرم اور ملائم فیلٹ اور دفتر سے لائی ہوئی کوئی بہت ہی اہم فائل تھام لینے کے لیے مُسکراتی اور شرماتی ہوئی پہنچ جاتی تھی۔ لیکن آج ابھی تک دور تک نظر آنے والی سڑک پر گہری کالی ہندوستان کار کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی۔

اس کا لمبے سیاہ بالوں کا جوڑا جو اُس نے دن میں گیارہ بجے بنایا تھا۔ ابھی تک مضبوط اور تازہ تھا۔ کیونکہ آج وہ دن بھر بستر پر نہیں لیٹی تھی۔ اس وقت شام کو اِس کا بالوں کو کھولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ شوہر کے لوٹنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے اُس کے ذہن میں الجھن پیدا ہو رہی تھی۔ بدن کے ہر ایک حصّہ میں جیسے کوئی عجیب سی

تکان آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی ہو۔

جب کچھ وقت اور بھی گذر گیا۔ تو وہ سمجھ گئی کہ آج ضرور کسی میٹنگ میں پھنس گئے ہوں گے۔ یا پھر کسی کے ساتھ کلب جانا پڑ گیا ہوگا۔ انتظار سے اُکتا کر وہ بالکونی سے ہٹ گئی۔ کمرے کی وہ کھڑکی کھول دی جس میں سے مکان کا پچھلا حصّہ نظر آتا تھا لڑکے سائیکل کے ایک پُرانے رِم کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ چیختے چلاتے ہوئے بچّے! جس کی ٹانگوں میں رِم اُلجھ جاتا تھا وہ مُنہ کے بل گرتا تھا۔ اُس وقت غل اونچا ہو جاتا تھا، تالیاں پیٹی جاتیں۔ ایک دوسرے کی پیٹھ پر مکّوں کی دھپا دھپ ہوتی اور ساتھ ساتھ کسی نہ کسی بچّے کے زور زور سے رونے کی آواز بلند ہو جاتی۔ اور پھر آس پاس کہیں سے ایک عورت کی گالی سُنائی دیتی —" وے مردارو! او نامرادو! بھگوان کرے میں تمہاری موت دیکھوں! تمہاری ہڈیاں —"

یہ سب کے سب لڑکے میلا رام کے تھے۔ میلا رام بنرل اسٹور میں کلرک تھا۔ مکان کے پچھلے حصّہ میں ایک موٹر گیرج اور اُس کے ساتھ بنے ہوئے ٹین کے چھت والے کمرے میں رہتا تھا، ٹین کی چھت پر دن بھر بندر بھی اُچھلتے تھے۔ اور لڑکوں کے پتھر بھی پڑتے تھے، جس سے پیدا ہونے والی آواز سے اس سڑک پر دور دور تک دونوں طرف رہنے والے مانوس ہو چکے تھے۔ میلا رام کے سات بچّے تھے۔ دو لڑکیاں اور پانچ لڑکے۔ بھاگونتی اِس کی بیوی تھی۔ سوکھا سڑا جسم، اور چڑ چڑا مزاج! بچوں کی معمولی سی حرکت پر سخت طیش میں آجاتی۔ ایسے وقت میں جس بچّے کو ایک بار پکڑ لیتی اُسے پانچ دس تھپّڑ لگائے بغیر نہ چھوڑتی۔ اسی وجہ سے بچّے اس کی پہنچ سے دور ہی رہتے تھے۔ آپس میں لڑتے بھڑتے۔ مار کھا بیٹھتے تو ماں سے شکایت بھی ضرور کرتے

لیکن اس کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔

گائیتری کو بھاگونتی کے اس سلوک سے سخت نفرت تھی۔ جو وہ اپنے بچوں سے کرتی تھی۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہوتی کہ ایک ماں اپنی کوکھ سے جنم دیے ہوئے بچوں کو مرنے اور گلنے سڑنے کی گالیاں کیونکر دے سکتی تھی! کیا وہ سچ مچ ایسا ہی چاہتی تھی؟ اُس نے یہ تو سُنا ہوا تھا کہ پنجابی بہت زیادہ غصیلے اور لڑاکے ہوتے ہیں اور کئی لوگوں کے لیے گالیاں تکیہ کلام بھی ہوتی ہیں لیکن اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک ماں غصے میں اپنی چھاتی پیٹ کر یا سر پر دوہتڑ مار کر ایسے شبد بھی منھ سے نکال سکتی ہے۔

"تیری ہڈیاں سلگیں۔ —— ہڈیاں!

تو جوانی مرے جوانی

دور ہٹ بدشکلے، بھوت کہیں کے"!!

یہ وہی ماں تھی۔ جس نے نو نو مہینے کوکھ کا بوجھ اُٹھا کر اور بے حد اذیت برداشت کر کے انھیں جنم دیا تھا۔ اور پھر اُس کے بچے بھوتوں کی طرح ہرگز بدشکل نہیں تھے خوب گورے چٹے! صحت آور اور چست و چالاک تھے۔ اُن کے ہاتھ پاؤں اور جسم دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ سب کے سب باپ کی طرح ۶ فٹ کے ہوں گے۔ لیکن اُن کے بدلن پر صاف ستھرے کپڑے شاذ و نادر ہی ہوتے تھے۔ اچانک اُس نے اپنے کمرے کے اندر پاؤں کی چاپ سُنی۔ جلدی سے گھوم کر دیکھا۔ اس کا خاوند مسکراتا ہوا چلا آرہا تھا اُس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ میں لپٹا ہوا پیکیٹ تھا۔ وہ اُس کی آمد سے بے خبر رہتی تو اگنی ہوتری پیچھے سے آکر ضرور اُس کی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر زور سے اپنے ساتھ چمٹا لیتا

اس خیال کے باوجود وہ مسکرا نہ سکی۔ اُسے آج یوں چپ دیکھ کر اگنی ہوتری نے اُسکی طرف توجہ سے دیکھا۔ لیکن صرف ایک لمحہ کے لیے پھر اُسی طرح مسکرانے لگا۔ شوخ اور چمکدار آنکھوں سے ہاتھ میں اُٹھایا ہوا پیکٹ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"کیا ہے ؟"

"کھول کر دیکھ لو۔"

اُس نے پیکٹ لے لیا۔ لیکن کھولنے سے پہلے پوچھا ـــ "آج بہت دیر کی!"

"ہاں کان پور سے خاں صاحب آگئے تھے۔ ایک منسٹر سے کام نکلوانا تھا۔ اُنہیں ساتھ لے کر منسٹر کے ہاں گیا تو معلوم ہوا وہ گورنر صاحب کے ہاں جا چکے تھے۔ اگرچہ فون پر ملنے کے لیے وقت لے لیا تھا۔ وہیں انتظار میں بیٹھے بیٹھے سات بج گئے۔"

اگنی ہوتری جلدی جلدی ٹائی اور کالر کوٹ، سویٹر اُتار اُتار کر ایک طرف پھینک رہا تھا۔ اچانک وہ رُک کر بولا: "تم نے ابھی تک پیکٹ نہیں کھولا؟"

گائتری کوئی جواب دیے بغیر پیکٹ کھولنے لگی۔ اس کے اندر ایک ریشمی ساڑھی تھی۔ اسے ہاتھ میں لے کر کچھ لمحوں تک غور سے دیکھا۔ اُسے انگلیوں کے درمیان مسلا اور پھر میز پر رکھ کر بولی ـــ "اس کی کیا ضرورت تھی؟"

اگنی ہوتری اُس کے قریب آکر بولا ـــ "ضرورت اس بات کی ہے کہ تم ابھی اسے باندھ کر میرے ساتھ چلو۔ آج بڑا اچھا موڈ ہے۔ گلاب دیئی سے کہدو کہ وہ کھانا تیار نہ کرے۔ کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔ گھومیں گے۔ کوئی پکچر دیکھیں گے۔ گلاب دیئی!!" وہ کمرے سے نکل کر کچن میں چلا گیا۔ گائتری ساڑھی کے کاغذ کو ہاتھ میں مروڑتی ہوئی پھر کھڑکی کی طرف چلی گئی۔ اُس کا شوہر کچن سے لوٹا تو کہنے لگا۔

"تم ابھی تک یونہی کھڑی ہو؟ چلوگی نہیں؟"

"نہیں۔ آپ ہی ہو آئیے۔"

"لیکن تم کیوں نہیں چلتیں؟ کیا میں اکیلا جاؤں؟"

"میرا جی اچھا نہیں ہے۔"

وہ اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ گائیتری چند لمحوں سے زیادہ خاموش نہ رہ سکی۔ بولی "دیکھئے تو میلارام کے بچّے کتنے غلیظ رہتے ہیں۔ اچھے کپڑے بھی انہیں نہیں پہنا سکتے۔ پھر بھی بچّے پیدا کیے جاتے ہیں۔ میں کہتی ہوں۔ انہیں ایسی حالت میں بچّے پیدا کرنے کا کیا حق ہے؟"

اگنی ہوتری نے کھڑکی میں سے جھانک کر نیچے دیکھا اور بولا ـــ "ایسا تم سمجھتی ہو تا وہ تو نہیں سمجھتے۔"

گائیتری کھڑکی سے نہ ہٹی اور نہ ہی بچّوں پر سے نگاہیں ہٹائیں۔ "گزشتہ سال جب چھوٹی مینا پیدا ہونے والی تھی تو میلارام نے اُن دنوں بھاگ ونتی کو کتنا کوسا تھا! ہر وقت بڑبڑاتا رہتا تھا۔ جیسے ساری ذمہ داری بھاگونتی کی ہو۔"

اگنی ہوتری اس کی بات سن کر ہنستا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔

برآمدے کے پرے لڑکوں میں پھر جھگڑا ہوگیا۔ چندر پرکاش نے پریم پرکاش کو پیٹ ڈالا تھا۔ پریم پرکاش چھوٹا ہونے کی وجہ سے روتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر بھاگونتی مینا کو دودھ پلاتی پلاتی باہر نکل آئی۔ ماں کو دیکھ کر سب لڑکے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ جس نے مار کھائی تھی وہی ہاتھ آگیا۔ بھاگونتی اُسے ایک ہاتھ سے گھر کی طرف دھکا دے کر بولی:- "جوانی مرا! بھنگی! تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ چندر کے ساتھ نہ کھیلا کر۔ وہ

موذی تمہیں دیکھ کر خوش تھوڑی ہوتا ہے! وہ تو چاہتا ہے کہ گھر کا کوئی بندہ زندہ نہ رہے اور وہ آرام سے کھیلا کرے آج آنے دے اُسے میرے ہاتھ میں۔ اس کی ہڈیاں نہ توڑیں تو آرام سے نہیں سوؤں گی۔ کبھی تو میرے ہاتھ آئے گا۔ اُس کے منہ میں لال لال دہکتے ہوئے انگارے دوں گی۔"

جب اچانک سامنے سے اپنی بڑی لڑکی سورج کو اسکول سے لوٹتے ہوئے دیکھا تو چلا کر بولی ــــ "اب ذرا جلدی جلدی قدم بڑھا نواب زادی! جلدی جلدی چلنے سے تیری ٹانگیں نہیں ٹوٹ جائیں گی۔ لے بہن کو سنبھال میں آگ پر دال چڑھا دوں۔ ابھی تمہارا باپ دفتر سے لوٹے گا تو بھوک کے مارے آدم بو آدم بو کہتا ہوا آئے گا۔"

ماں کی طرح پتلی اور باپ کی طرح لمبی اور خوبصورت سورج نے جلدی سے آگے بڑھ کر مینا کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر اُسے ماں کی بغل سے گرنے سے بچا لیا۔ اُس کے دوسرے بازو پر کتابیں تھیں۔ کتابوں کو صحن کی پست قد دیوار پر رکھ دیا پھر مینا کو بھی وہیں بٹھا دیا اُس کے میلے فراک سے اُس کی ناک پونچھ کر اُسے ایک فلمی گیت سُنانے لگی۔

گائیتری ابھی تک یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ مینا کو دیکھ کر وہ اُداس ہو جاتی تھی۔ جب یہ لڑکی پیدا ہوئی تب چند روز کے بعد اُس کے ہاں بِٹّی پیدا ہوا تھا۔ بہت صحت مند اور بھولا بھالا۔ ساڑھے سات پونڈ وزن تھا۔ بالکل باپ جیسا رنگ اور روپ۔ لیڈی ڈاکٹر نے دو سَو روپے کا بل دیا تھا۔ جب اُس کا نام رکھا گیا تھا تو اُنھوں نے کتنی اعلیٰ درجہ کی دعوت کی تھی۔ کارنٹی سے سب انتظام کرایا تھا۔ بجلی کی روشنی تھی کہ روشنی کا سمندر۔ اتنے آسودہ ہونے کے باوجود وہ لڑکا موت کے چنگل سے نہیں بچایا جا سکا تھا۔ آج وہ زندہ ہوتا تو مینا جتنا بڑا ہوتا۔ بیٹھنا سیکھ چکا ہوتا۔ گھٹنوں چلتا ہوتا۔ اس کی موت کا

دُکھ اس لیے بھی زیادہ تھا کہ اب وہ مزید اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تھی بچے کی پیدائش کے بعد اُسے مجبوراً ایک آپریشن کی منزل سے گزرنا پڑ گیا تھا۔ بالکل اچانک اور مجبوراً۔ لیکن اُس کے خاوند کو بچے کی موت کا کوئی دکھ نہیں تھا وہ خوش تھا کہ گائتری کی جان بچ گئی تھی۔

مینا کے نقوش چونکہ سب بہن بھائیوں سے اچھے تھے۔ اس لیے بھی وہ گائتری کو پیاری لگتی تھی۔ وہ کبھی کبھی سورج کو اُسے لے آنے کے لیے کہہ دیتی۔ مینا کو اپنے کمروں کے فرش پر گھٹنوں کے بل چلتا دیکھ کر اُسے بے پناہ خوشی ہوتی۔ جب بھی مینا اُس کے گھر آتی وہ اُسے اپنے مرحوم بچے کی الماری میں سے ایک نہ ایک کھلونا نکال کر دے دیتی۔ ایک دن اچانک اُسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ اس لڑکی کو گود لے لے بھاگونتی اُس کی اچھی طرح پرورش بھی نہیں کر سکتی۔ اُس کے اتنے بچے ہیں کہ ہر ایک کی مناسب دیکھ ریکھ کرنا اُسکے لیے ناممکن ہے وہ فوراً مان جائے گی۔ اس خیال سے اُس کی رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے اپنے شوہر کے ساتھ سینما جانے کا پروگرام رد کر دیا تھا۔ اب اُس کے لیے بالکل تیار تھی۔ جس نئی ساڑھی کو اُس نے نہایت بے دلی سے ایک طرف رکھ دیا تھا اُسے اُٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں اُس کا شوہر آرام کرسی پر لیٹا ایک فلمی اخبار دیکھنے میں مصروف تھا۔ گائتری نے اُسے اپنے خیال کا رازدار بنانے کا فیصلہ بدل دیا۔ سوچا کہ جب وہ بھاگونتی کے ساتھ بات چیت طے کرے گی تب اپنے خاوند کو بتائے گی۔ وہ پیچھے سے جا کر کرسی کی پشت پر جھک گئی۔ وہ اُس کی ہوتری کے بالوں پر اپنا ایک گال رکھ کر کہنے لگی

—— "چلیے کونسی پکچر دیکھنے کا ارادہ ہے؟"

اگنی ہوتری چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ "کیا بیج؟ ابھی چلتا ہوں۔"

"زیادہ دیر نہ لگائیے۔ آٹھ بج چکے ہیں۔"

* * * * * * * *

دوسرے دن صبح ہی وہ کھڑکی پر ایک نئی اُمنگ لے کر جا جھکی۔ بھاگ ونتی کے لڑکے اسکول جا رہے تھے۔ چندر پرکاش، پریم پرکاش، اوم پرکاش اور بسنت پرکاش! بے ڈھنگی نیکریں، کسی کی قمیص کے بٹن غائب، کسی کی بش شرٹ کا رنگ اُترا ہوا۔ جوتوں کی ایڑیاں بھی گھسی پٹی تھیں۔ ایک دوسرے کو دھکا دیتے اور ہنستے ہوئے چلے جا رہے تھے وہی ٹھٹھ سے ناشتہ کرنے کے بعد کسی نے منہ نہیں پونچھا ہوا تھا۔ میلا رام سائیکل پر اُسی وقت ریلوے یارڈ سے دودھ کی بالٹی لے کر آیا تھا۔ وہ ہر وقت جلدی میں ہوتا۔ کم تنخواہ میں کتنے بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ اُن کی پڑھائی لکھائی اور کپڑوں کا خرچ بڑی مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ خود بھی مجبوراً بغیر پریس کی ہوئی پینٹ اور قمیص پہنتا تھا۔ سر پر رکھنے کے لیے اس کے پاس ایک بہت ہی پرانا ہیٹ تھا۔ قد کا اتنا لمبا تھا کہ سائیکل پر بیٹھ کر اور بھی اونچا دکھائی دیتا تھا۔ سائیکل پر بڑی آسانی سے ٹانگ گھما کر بیٹھ جاتا۔ اُسے دیکھ کر گائیتری کو ہنسی آجاتی۔ وہ کھڑکی میں کھڑی مینا کو ڈھونڈھ رہی تھی آج وہ بھاگونتی سے مینا مانگے گی۔ بھاگونتی اُسے انکار نہیں کرے گی۔ اُسے ذرا فرصت ہولے۔ وہ نیچے جا کر اطمینان کے ساتھ اُس سے بات کرے گی۔

گیارہ بجے کے قریب وہ نیچے اُتری۔ اپنے مکان سے نکل کر پچھلے حصّہ میں گئی جس گیرج اور کمرے میں وہ لوگ رہتے تھے وہ گپتا ٹریڈنگ کمپنی کی ملکیت تھے گپتا جی نے میلا رام پر ترس کھا کر گذشتہ آٹھ سال سے بہت ہی معمولی کرائے پر

اُسے دے رکھے تھے۔ صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ اُس نے اندر جا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بھاگونتی کہیں نظر نہ آئی۔ کمرے کے فرش پر مینا بیٹھی تھی۔ کچے چاولوں کی مُٹھی بھر کر منہ میں ڈال چکی تھی۔ گائیتری اُسے دیکھ کر مسکرادی اور اُسے گودی میں لینے کے لیے آگے بڑھی۔ دھوتی کے آنچل سے اس کا منھ صاف کیا۔ مُنھ میں اُنگلی ڈال کر سب چاول نکلوائے اور پھر اُسے اپنی چھاتی سے لگا کر بھاگونتی کو ڈھونڈ نے لگی۔

اُس کی آواز سُن کر بھاگونتی غسل خانے سے باہر نکل آئی۔ نیم برہنہ۔ ایک نیان اور کچھہ پہنے۔ بالوں کا گردن کے اوپر کس کر جوڑا باندھے۔ اُس کے بازو پانی اور صابن کی جھاگ سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کے سر کے بالوں پر پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ گائیتری کو دیکھ کر وہ کچھ حیران سی ہو گئی۔ کیونکہ گائیتری یہاں بہت کم آتی تھی۔ چارپائی پر پڑے ہوئے میلے کپڑوں کا ڈھیر ایک طرف سمیٹتے ہوئے بولی۔

"یہاں بیٹھیے"

گائیتری بیٹھ گئی۔ مینا کو چومتی ہوئی۔ اُسے گُدگُدی کرتی ہوئی۔ اور پھر پوچھا

"بہت کام رہتا ہے آپ کو؟"

"یہ کام تو میری جان کا روگ ہے۔ نہ کروں تب بھی میری جان کو کھاتا ہے۔ کروں تب بھی۔" وہ کسی قدر ہانپ رہی تھی۔

"ہاں یہ تو میں دیکھتی ہی رہتی ہوں کہ آپ کو کام سے فرصت بہت کم ملتی ہے۔" گائیتری نے ہمدردی کی راہ اختیار کی۔ یہ بات کہہ کر جیسے اُس نے بھاگونتی کی دُکھتی ہوئی رگ پر اُنگلی رکھ دی۔ بازوؤں پر لگی صابن کی جھاگ اُنگلیوں سے جھٹک کر بولی

"فرصت! فرصت کس بلا کا نام ہے؟ میں نے تو آج تک اس کا نام نہیں سُنا۔ اب یہی کپڑے ہیں۔ انہیں دھوتے دھوتے دو گھنٹوں سے کیا کم لگیں گے۔ پھر انہیں دھوپ میں پھیلاتے پھیلاتے گھنٹہ بھر لگ جائے گا۔ اتنے میں بچے اسکولوں سے آدھی چھٹی میں گھر بھاگ آئیں گے۔ انہیں کھلا پلا کر دفع کروں گی تو گیہوں صاف کرنے کی باری آجائے گی۔ اسی طرح شام ہوجائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ غسل خانے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر کپڑے دھونے میں مصروف ہوگئی لکڑی کے ایک ڈنڈے سے گیلے اور صابن لگے کپڑوں کو پیٹنے لگی۔ دھپ دھپ دھپ!!

گائیتری نے مینا کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "جب آپ اتنی مصروف رہتی ہیں تو اس بیچاری کی کون خبر لے سکتا ہے۔ چاہے مٹی میں کھیلے چاہے کچھ کرے۔ ابھی میں آئی تو دیکھا کہ کچے چاولوں سے منہ بھر کر بیٹھی ہوئی ہے۔ شریر کہیں کی! مجھے جانے کیوں پیاری لگتی ہے۔ اس کے رونے کی آواز میرے کانوں میں پہنچتی ہے تو بے قرار ہو اٹھتی ہوں۔ جی چاہتا ہے اسے اپنے پاس رکھ لوں اور کبھی نہ رونے دوں!"

اُس نے مینا کو پھر چوما۔ گدگدی کی۔ بھاگونتی کپڑے دھونے میں مصروف رہی۔ پانی کے چھینٹے غسل خانے سے نکل نکل کر ادھر اُدھر پڑتے رہے۔ مینا پر بھی اور گائیتری پر بھی۔ گائیتری نے پھر کہنا شروع کیا۔

"بہن جی، میری ایک بات مانیے تو کہوں۔"

بھاگونتی نے ذرا سی دیر کے لیے سر گھما کر اُسکی طرف دیکھا۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔

"میں چاہتی ہوں مینا کو اپنی بیٹی بنا لوں۔ اسے مجھے دیدیجئے۔ میں اسے پاکر بیٹی کا غم بھول جاؤنگی۔ اکیلے میں میرا جی بہت گھبراتا ہے!"

بھاگونتی نے اُسی طرح کپڑے دھوتے ہوئے جواب دیا: "کیا بات کہی ہے بہن! دوسرے کے بچوں سے بھی کیا، اپنا غم کسی نے ہلکا کیا ہے!"

"ہاں کیوں نہیں!! اس سلسلے میں میں آپ کو کتنی مثالیں دے سکتی ہوں۔ میرے ماما جی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ یتیم خانہ سے ایک بچہ لے آئے تھے۔ آج وہی بچہ اِن کے کارخانے کا مالک ہے۔ ہم بھی مینا کو وہی حق دیں گے جو ایک بیٹی کا ہوتا ہے آپ سے اتنے سارے بچوں کی ٹھیک طرح سے دیکھ بھال تو ہوتی نہیں۔ ایک بچی کو میں لے لونگی تو آپ کے ہاں کون سی کمی ہو جائے گی!"

بھاگ ونتی نے کپڑے دھونے بند کر دیے۔ غسل خانے سے باہر نکل آئی۔ اور کولہوں پر ہاتھ رکھ کر بولی "آج یہ بات منہ سے نکالی ہے پھر نہ نکالیے گا۔ کوئی اپنے جسم کا گوشت کاٹ کر پھینک نہیں دیتا۔ میں اِنہیں دو وقت نہیں کھلا سکوں گی تو ایک ہی وقت کھلایا کروں گی۔ لیکن اپنی آنکھوں سے دور نہیں کر سکتی۔ ایسی ہوتی ہونگی مائیں جن کے ـــــ کوئی ـــــ آپ منہ سے کیوں کہلواتی ہیں۔ لائیے مینا کو مجھے دیدیجیئے!"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر گائیتری کے ہاتھوں سے مینا کو قریب قریب چھین لیا اور اپنے پانی سے تربتر جسم کے ساتھ چمٹا لیا۔ گائیتری ہکّا بکّا ہو کر رہ گئی۔ چند لمحوں تک وہ بول نہ سکی۔ بالآخر اُس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"آپ تو ناراض ہو گئیں۔ میں نے سوچا تھا کہ مینا آپ کی آنکھوں کے سامنے بھی رہا کرے گی۔ یعنی آپ جب جب چاہیں اُسے بلا لیا کریں گی، لیکن اب میں کیا کہوں جب کہ آپ کا خیال ہی دوسرا ہے!"

گائیتری وہاں سے زخمی دل لے کر لوٹی۔ گھر آ کر بستر پر اوندھی لیٹ گئی، شام تک

اُسی طرح پڑی رہی۔ کتنی مرتبہ اس کے آنسو نکل پڑے۔ اُسے اپنا بڑپن یاد آرہا تھا۔ اُسے اب اپنا بڑپن کون دے سکتا تھا۔ کوئی بھی نہیں۔ اُس کے اندر سے ماں ہونے کا غرور اور فخر چھِن چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دوسری عورتوں سے بہت کمتر محسوس کرتی تھی، جیسے اب وہ عورت بھی نہیں تھی۔ عورت اگر ماں ہے تو عورت ہے ورنہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اُس کے ہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی اچھی تنخواہ لے آنے اور محبت کرنے والا شوہر، قیمتی فرنیچر اور کپڑے، کار، ریفریجریٹر، ریڈیو گرام!! لیکن یہ سب ہیچ تھا۔ اُس کے لیے کس خوشی کا باعث تھا جب کہ وہ بچہ پیدا کرنے سے محروم ہوچکی تھی!

شام کو اگنی ہوتری آیا اور گائیتری کے اُترے ہوئے چہرے کا راز معلوم کیا تو بہت ہنسا۔ اُسے بے وقوف اور ناسمجھ کہا۔ اُسے پیار کرکے اس کا دل بہلانے کی کوشش کی۔ لیکن گائیتری کا جی ہلکا نہ ہوا۔ سوچتی رہی اُس کے شوہر مذہبی خیال کے مالک ہیں۔ انہیں بھگوان کی مرضی پر بھروسہ ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو ضرور شانتی دے سکتے ہیں لیکن اس کے دل کو ہرگز نہیں۔ اُنہیں کیا معلوم کہ ایک ماں کا دل کیسا ہوتا ہے۔!

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ایک دن سورج اُس کے پاس شام کو آئی اُس نے مینا کو اُٹھا رکھا تھا۔ وہ بہت اُداس تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تھوڑی دیر پہلے خوب روئی ہو۔ گائیتری نے مینا کو دیکھتے ہی اُسے اپنی گود میں لے لیا پھر سورج سے اس کی اُداسی کا سبب پوچھا سورج کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ روتی ہوئی بولی:"سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں؟ آج ہمارے اسکول میں جلسہ ہے۔ اس وقت شروع ہوچکا ہوگا۔ سالانہ امتحان میں اوّل آئی تھی۔ انعام حاصل کرنے والی لڑکیوں میں میرا بھی نام ہے لیکن وہاں پہن کر

جانے کے لیے میرے پاس کوئی بھی کام کا کپڑا نہیں ہے۔ ان میلے کپڑوں کے ساتھ وہاں سب کے سامنے جاؤنگی تو کتنی شرم آئے گی! لوگ کیا کہیں گے!"

سورج کے چہرے پر غصّے کی جھلک بھی نظر آئی، وہ اپنے ماں باپ سے ناراض تھی لیکن اس وقت وہ اُن کی مجبوریوں کو نہیں سمجھ رہی تھی۔ گائیتری نے کچھ سوچکر اُس کے سامنے ایک تجویز رکھی "اگر تم میری دھوتی بلاؤز پہن کر وہاں چلی جاؤ تو کیا حرج ہے؟ میرے پاس بہت سی دھوتیاں ہیں۔ میں تمہیں ایک جوڑا ہمیشہ کے لیے دے سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے تمہارے بدن پر میرا بلاؤز بالکل پورا ہوگا کیونکہ ہم دونوں ایک جیسی تیلی ہیں۔ کیوں؟"

یہ سُن کر سورج حیران رہ گئی۔ کچھ لمحوں تک وہ سوچتی رہی پھر مسکرا کر بولی "آپ بہت اچھی ہیں۔ لیکن مجھے ماں سے ڈر لگتا ہے۔ کیا یہ ٹھیک نہیں ہوگا کہ میں آپ کے کپڑے پہن کر سیدھی یہیں سے اسکول جاؤں اور وہاں سے واپس آکر آپ کو لوٹا دوں؟ آپ سے کپڑوں کا تحفہ اس لیے نہیں لے سکتی کہ ماں ایسا کرنے نہیں دے گی۔"

گائیتری اُسے خوش دیکھ کر بہت مسرور ہوئی۔ سورج نے جو کچھ کہا تھا وہی مناسب تھا اُس نے جلدی سے اندر جاکر پرنٹڈ وائل کی ایک دھوتی اور ایک سیاہ ریشمی بلاؤز نکالا سورج نے وہیں جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر لیے۔ گائیتری نے اُس کے بال بنانے میں مدد کی۔ جب وہ بن سنور کر آئینے کے سامنے گئی تو وہ خود کو دیکھ کر شرما گئی۔ خوبصورت تو تھی ہی صرف اچھے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ مینا کو گائیتری کے حوالے کرکے اسکول چلی گئی۔

سورج کے جانے کے بعد گائیتری نے پہلا کام یہ کیا کہ مینا کو غسل خانے میں

لے جاکر اُس کا مُنھ ہاتھ دھویا۔ پوڈر اور سُرمہ لگایا۔ بالوں میں ریشمی ربن باندھا۔ مرحوم بچّے کا ایک فراک نکال کر پہنایا اور ایک کھلونا دیا۔ اگنی ہوتری جب لوٹا تو بیوی کو ایسی لگن میں دیکھ کر اُداس ہو گیا۔ بولا: "فرض کرو کہ تمہیں مینا مل بھی جائے تب بھی تم اُسے اپنی مرضی کے مطابق اپنے ماحول میں ڈھال نہیں سکو گی؟"

"کیوں؟ کیوں نہیں؟ اگر سچ مچ ایسا ہو تو جائے!"

"ارے بھائی اس کے ماں، باپ، بہن، بھائی ہر وقت اسے چمٹے رہیں گے۔ اور یہ اپنی کوئی بھی پُرانی عادت نہیں چھوڑ سکے گی۔"

"آپ پہلے یہ بات طے تو کرا دیجئے۔ پھر یہ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ سے پہلا کام یہ کرنے کے لیے کہوں گی کہ اپنی تبدیلی کسی دوسری جگہ پر کرا لیجئے۔ میں اسے پُرانے گھر کی ہوا تک لگنے نہیں دوں گی۔"

سُورج واپس آئی تو اپنے ساتھ انعام میں ملی ہوئی کچھ کتابیں لائی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اپنے گھر کے ماحول سے بالکل مختلف اور ذہین نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ اُسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ پھر بھی اُس نے چنتا کی کوئی جھلک نہ دکھائی۔ وہ سچ مچ بیحد خوش تھی۔ جب گائیتری نے اُسے کہا کہ وہ انہی کپڑوں میں گھر چلی جائے تو وہ مان گئی مینا کو لے کر گھر چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب گائیتری اور اُس کا خاوند کھانا کھا رہے تھے تو کپڑوں کا ایک بنڈل اُٹھائے ہوئے بھاگونتی آ پہنچی۔ اُس کے سامنے کپڑے پھینک کر بھاگونتی بولی: "میم صاحب! کیا آپ نے ہمیں فقیر سمجھ لیا ہے؟ سڑک پر بہت سے مانگنے والے گذرتے رہتے ہیں۔ کسی کو دے دیجئے گا۔ ہمیں نہیں چاہئیں۔ بھگوان نے جتنی طاقت دی ہے اُسی کے مطابق کھائیں گے اور پہنیں گے۔ ایسی نوازشوں سے

ہمیں معاف ہی رکھا کیجیے۔"

یہ سُن کر گائیتری کو بہت دُکھ پہنچا۔ بولی:"میں تو سورج کو اپنی چھوٹی بہن سمجھتی ہوں مجھے اُس سے بہت محبت ہے۔"

"نہیں جی یہ محبّت نہیں ہے۔ بُرائی کی جڑ ہے میں اسے اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ آپ کی محبت کی وجہ سے وہ دن بدن سر پر چڑھ رہی ہے۔ گھر کی کوئی بات اُسے پسند نہیں آتی!"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ گائیتری اُس عورت کے رویّے سے بہت پریشان اور حیران تھی۔ یہ صحیح تھا کہ وہ بھاگونتی سے زیادہ آسودہ حال تھی اُس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن وہ کسی طرح سے مغرور نہیں تھی۔

* * * * * * *

گائیتری کے پاس فلمی رسالوں کی بہت بہتات تھی۔ اُنہیں دیکھنے کے لیے سورج ماں سے چھپ کر آتی رہتی۔ کبھی کبھی ساتھ مینا کو بھی لے آتی ان دونوں لڑکیوں پہ گائیتری کو بڑا ترس آتا تھا۔ وہ اُن کی کچھ مدد نہیں کرسکتی تھی۔

ایک دن گائیتری کو ایک نیا خیال سوجھا۔ اُس نے اپنے خاوند کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ کہ وہ میلارام کے افسروں سے کسی طرح مل کر اُسے ترقی دلانے کا بندوبست کردیں۔ اگنی ہوتری اس معاملہ میں کوئی دلچسپی نہیں لینا چاہتا تھا لیکن اُسے بیوی کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال کر یہ کام کرنا پڑا۔ میلارام پہلے ڈیڑھ پونے دوسو تنخواہ پاتا تھا۔ اب اُسے تین سو ملنے لگے۔ وہ ایک کلرک سے ترقی کرکے انسپکٹر بن گیا اب وہ کبھی کبھی اگنی ہوتری سے ملنے آیا کرتا تھا۔ کبھی خدمت اور خیریت پوچھنے، کبھی اپنے کسی کام کی غرض سے۔ گائیتری خوش تھی کہ وہ میلارام کو اپنے اسقدر

قریب لے آئی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح بغیر برس کے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے نہیں پہنتا تھا۔ ترقی پاتے ہی اس نے ایک نیا گرم سوٹ سلوا لیا تھا۔ شکل و صورت سے وہ معمولی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن بھاگونتی اُسی طرح تنی رہتی تھی۔ سامنے ہونے پر بھی محبت سے کوئی بات نہیں کرتی تھی۔

اچانک بھاگونتی کے ایک لڑکے کو کن پیڑے نکل آئے یہ بیماری چھوت چھات سے پھیلتی ہے۔ چند ہی روز کے بعد دو بچے اور بھی بستر پر لیٹ گئے۔ تین بچوں کی تیمارداری کرنے کے ساتھ ساتھ دو اور چھوٹے بچوں کو سنبھالنا بڑا مشکل تھا۔ گائیتری نے بھاگونتی کو کسی طرح سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ جب تک بیمار بچے ٹھیک نہیں ہو جاتے مینا اس کے پاس رہے گی۔ اس طرح وہ بیمار ہونے سے بچ جائے گی۔

گائیتری کو اپنا خواب سچا ہوتا نظر آیا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سماتی۔ اب مینا ہر وقت اُس کے پاس رہتی تھی۔ اُسے نہلاتی، کھلاتی، اچھے اچھے نئے فراک لے کر دیے دن میں ایک آدھ بار بھاگونتی آ کر اسے دودھ پلا جاتی۔ گائیتری نے اُسے بوتل کا دودھ پلانا شروع کر دیا تھا

کن پیڑوں کی بیماری نے میلا رام کو بھی بستر پر لٹا دیا۔ اسی میں پچیس روز نکل گئے اب تک صرف بھاگونتی، سورج اور مینا بچی ہوئی تھیں۔ ایک دن گائیتری نے سوچا۔ اُس کے باپ نے مرنے سے پہلے اُس کے نام چھ ہزار روپے چھوڑے تھے۔ اُس کا شوہر ان روپوں کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ایک بہت بڑی موروثی جائیداد اور نقدی کا مالک تھا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح شوہر کو کار خریدتے وقت ساڑھے تین ہزار روپے اُس رقم میں سے لے لینے پر مجبور کر لیا تھا۔ اب باقی اڑھائی ہزار روپے ایک مدت سے بنک میں پڑے تھے۔ ان کا کوئی مصرف نہیں تھا اگر وہ ان روپوں کو کسی طرح میلا رام کے

بال بچّوں کی حالت سُدھارنے پر خرچ کرتو سکے کتنا اچھا ہوگا۔ وہ لوگ براہِ راست کسی قسم کی امداد لینا قبول نہیں کرتے تھے۔ امداد کسی ایسے طریقے سے بھی دی جاسکتی تھی کہ جس سے اُنہیں کسی طرح کی توہین محسوس نہ ہوتی۔ اُس نے سُورج کو بلاکر سمجھایا کہ وہ اپنی ماں کو کم از کم تین بچّوں چندر، پریم اور اوم کو پرانے اسکول سے نکال کر شہر کے جدید تعلیم دینے والے سکول میں داخل کرانے پر راضی کرے۔ تعلیم کے اخراجات وہ برداشت کیا کرے گی۔ یہ رقم وہ اُنہیں وظیفے کے طور پر دیگی۔ پھر بھی اگر بھاگونتی چاہے تو جب بھی ادا کر سکے، کر دے۔ پانچ سال، دس سال، بیس سال، جب اِس کا جی چاہے!

سورج جب یہ تجویز لے کر ماں کے پاس گئی تو اُس کی ماں غصّے سے بھڑک اُٹھی فوراً آکر مینا کو بھی لے گئی اور کہہ گئی ــــ "اِس وقت تک آپ نے ہم پر جو دیا کی ہے وہ ہم نہیں بھولیں گے۔ لیکن اِس کے بعد ایسی کوئی بات مت سوچیے گا۔"

گائیتری اِس عورت کے عجیب غریب رویّہ کو قریب قریب جان چکی تھی۔ اس لیے اس بار اُس نے بھاگونتی کے انکار کو زیادہ محسوس نہ کیا۔ صرف ہنس کر رہ گئی۔ لیکن اب اُسے اِس بات کی فکر دامن گیر ہوگئی کہ کہیں مینا بھی بیمار نہ ہوجائے۔ کیونکہ اُن کے گھر سے یہ بیماری ابھی مکمل طور پر نہیں گئی تھی۔ سب سے بڑا لڑکا چندر پرکاش ابھی تک بستر میں تھا۔ گائیتری چاہتی تھی کہ چندر پرکاش کے ٹھیک ہوتے ہی میونسپلٹی والوں کو اطلاع دے کر اِس پورے مکان کو ڈس انفیکٹ کرالیا جائے۔ لیکن وہ اِس تجویز کو بھاگونتی کے سامنے نہیں رکھ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بھاگونتی اس کا کوئی دوسرا مطلب نکال لے گی۔ گائیتری بھاگونتی کے پاس چندر پرکاش کی خیریت دریافت کرنے روز جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ اُسے مینا کے بارے میں احتیاط کرنے کے لئے بھی کہہ

آیا کرتی تھی۔ وہ مینا کو حاصل کرنے میں مایوس ہو چکی تھی پھر بھی مینا کی محبت اُسے وہاں آتے جاتے رہنے کے لیے مجبور کیے ہوئے تھی۔

ایک دن مینا کو بھی بخار آگیا اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔

مینا کے کن پیڑے نکل آئے تھے۔ اُسکی گردن سوج کر کانوں اور ٹھوڑی کے برابر ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک سو تین اور چار درجے تک بخار آنے لگا تھا۔ ایسی حالت گھر میں اور کسی کی نہیں ہوئی تھی۔ گائیتری کے لیے تو جیسے آرام حرام ہو گیا۔ اپنا گھر چھوڑ کر مینا کے پاس رہنے لگی۔ اگنی ہوتری نے اُسے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانی۔ بھاگونتی کی اپنی حالت بھی تسلی بخش نہیں تھی وہ حد درجہ سُست نظر آرہی تھی۔ اسکے بدن میں جیسے کام کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ سورج کو گھر کا کام کاج کرنے کی ہدایات دیتی رہتی تھی اُسے بخار وخار نہیں آرہا تھا۔ نہ ہی اُس چھوت کی بیماری کا اُس پر کوئی حملہ ہوا تھا۔ ایکدن گائیتری اُس کا سبب پوچھ بیٹھی تو اُس نے بہت بے زاری سے جواب دیا" یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے! آجتک کس بچے نے جی بھر کر میرا دودھ پیا ہے؟ ہر ایک کو بھگوان گواہ ہے کہ بیچ میں ہی دودھ چھڑا دینا پڑا۔ اب میں کیا کروں؟ عورت کے ساتھ صرف یہی ایک دُکھ نہ ہوتا تو وہ کتنی سُکھی ہوتی!!"

یہ سُن کر گائیتری کے آنسو نکل پڑے۔ مینا اس کی گود میں لیٹی ہوئی تھی۔ بخار میں بے سُدھ۔ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی ــــ کیا آپ مجھے بہت سُکھی سمجھتی ہیں؟ اولاد کے بغیر عورت کیسے سکھی رہ سکتی ہے؟ آپ سے میں نے مینا کے لیے ایک ہزار بار کہا ہو گا۔ لیکن آپ نے میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ آج آپ کو اسقدر پریشان دیکھ کر محبت کا دامن پھر پھیلاتی ہوں، یہ آپ کا مجھ پر احسان ہو گا۔ میں ہی خود کو آپ کا ہمیشہ

قرضدار سمجھوں گی۔"

بھاگ ونتی نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ آج اُس کی آنکھوں میں غصے کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ جلدی سے اُٹھ کر نالی کے پاس جا بیٹھی وہاں اُسے قے آ ئی۔ جب جی ہلکا ہوا تو واپس آ کر بولی ـــــ "اب تمہیں کچھ کہنا بیکار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ بچّے کی موت کے بعد تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اب تمہارے خاوند سے ہی کہنا ہوگا۔ میں اپنے بچّے کسی کو نہیں دے سکتی۔ میں نے خود انہیں پیدا کیا ہے خود ہی اُن کی پرورش کرونگی۔ چاہے گندے ہیں، بیمار ہیں، شریر ہیں، میرے لیے چاند اور سورج ہیں۔ اَب آپ جائیے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ بینا کو یہیں لٹا دیجیے"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر گائیتری کی گود سے بینا کو لے لیا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ بینا رونے لگی۔ خود بھی اُسی چارپائی کے دوسرے سرے پر دُوپٹے سے سر باندھ کر ہانپتی ہوئی پڑ رہی۔ جیسے اُس کا جی متلا رہا ہو۔ گائیتری چارپائی کے پاس حیران اور پریشان کھڑی رہی۔ اُس کا دِل زخمی تھا۔ اُس نے آج پہلی مرتبہ ہتک محسوس کی تھی۔ جیسے اُس کو گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا ہو۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی؟

نیند نہیں آتی

(اپنے مرحوم بچے سودی کے نام)

سنہ ۱۹۵۶ء

بڑی عجیب بات ہے کہ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ رات کے دو بج رہے ہیں میں سونا چاہتا ہوں۔ میرے بچے میرے ساتھ پلنگ پر دائیں بائیں سو رہے ہیں دوسرے پلنگ پر میری بیوی شکنتلا منھ پھیر کر لیٹی ہوئی ہے۔ یقیناً وہ بھی سو چکی ہو گی غموں کی ماری! اُسے آخر کب تک نیند نہ آتی۔ چار روز سے برابر جاگ رہی تھی۔ اس دوران میں ایک لمحہ کے لیے بھی آنکھیں بند نہ کیں۔ جب سے سودی کو کھانسی اور بخار نے آ گھیرا اُسے کل نہیں پڑی۔ سینے کے ساتھ سودی کو چمٹائے پاگلوں کی طرح کبھی ڈاکٹر سے کبھی بھگوان سے اس کی صحت کی بھیک مانگتی رہی۔ آج نحیف اور جگر دوز آواز میں مسلسل کھانستا ہوا سودی اس دُنیا میں نہیں ہے۔ اس پلنگ پر نہیں ہے اپنی ماں کی آغوش میں نہیں ہے۔ آج اس کی ماں اکیلی سو رہی ہے۔ مُنھ ڈھانپے، انتہائی سردی کی وجہ سے سر کو ڈوپٹے سے باندھے۔ سودی کی خالی کی ہوئی جگہ پر اپنا ہاتھ رکھے ہوئے ــــــ !

"شکنتلا"! ــــــ شکنتلا، سو گئی ہو کیا؟ ــــــ نہیں! میں سمجھا سو گئی ہو۔ ہاں میں بھی جاگ رہا ہوں۔ نیند نہیں آتی۔ جانے کیا بات ہے۔ ہاں بات تو وہی ہے۔ سودی کے چھن جانے کا بیحد رنج ہے۔ آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں ہے۔ وہ بھولا بھالا اور کمزور سا چہرہ کسقدر کُھلا گیا تھا۔ بچارا! بچہ پھول ہی تو ہوتا ہے۔ نہ زیادہ سردی

برداشت کر سکتا ہے نہ گرمی۔ اُسے یقیناً نمونیا ہی ہو گیا تھا۔ ڈبل نمونیہ! ـــ تم تو کہتی تھیں کسی کا سہلیہ ہے۔ تم بھی ایک حد ہو۔ کیا کہا؟ گنگو کی ماں کہتی تھی؟ گنگو کی ماں کون ہوتی ہے۔ ایسی باتیں بتانے والی؟ تمہیں خود اس کی باتوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیئے تھا۔ جیسے ہی بچے کی طبیعت خراب ہوتی نظر آئی تھی۔ سیدھے ڈاکٹر کے پاس چلی جاتیں، ہاں میرا بھی تو قصور ہے اس میں۔ بلکہ حماقت ہی کہوں گا۔ بچے کی دیکھ دیکھ کی ساری ذمہ داری تم پر ڈال کر جیسے خود سبکدوش سا ہو گیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ سودی کو ڈبل نمونیہ ہوا ہے تو میں نے کتنے ڈاکٹر اکھٹے کر دیے ہوتے لیکن معلوم کیسے ہوتا؟ حماقت نے تو آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ تم بھی تو ہسپتال سے "معمولی بخار" کا نسخہ لے کر لوٹ آئی تھیں اُسی اسپتال سے جس میں سودی نے جنم لیا تھا تم نے آکر بتایا تھا پورے چار گھنٹے لائن میں کھڑے رہنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے کی باری آئی تھی۔ اس پر بھی لیڈی ڈاکٹر نے سودی کو نظر انداز کر کے ایک اور مریض کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ جس کے لیے اسپتال کے کسی کارندے نے خود آکر سفارش کی تھی اور جب لیڈی ڈاکٹر نے سودی کی طرف دھیان دیا بھی تو بہت معمولی۔ نہ نبض دیکھی نہ بخار اور نہ ہی سٹیتھسکوپ سے سودی کے بلغم اور سردی سے لدے ہوئے پھیپھڑوں کا معائنہ کیا۔

"کیا بخار آتا ہے؟"

"جی ہاں!"

"پیٹ بھی خراب ہے؟"

"جی ہاں! ڈاکٹر صاحب! اسے کھانسی بھی ہے۔ ساری رات کھاؤں کھاؤں

کرتے گزر رہی ہے۔ اور جب سے ۔۔"

"یہ لو"

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے تمہارے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما دیا۔ اُس نے تمہیں پوری بات بھی نہ کہنے دی۔ تم کہنا چاہتی تھیں۔ یہ میرا چوتھا بچہ ہے۔ اِس بچے کا جنم ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنے ہاتھوں سے کرایا تھا۔ اور آپ نے میرا آپریشن بھی تو کیا تھا۔ یاد ہے؟ ڈاکٹر صاحب اس آپریشن کے بعد سے تو میں ــــ جانے تم نے کیا کیا سوچ رکھا تھا کہنے کے لیے۔ سب باتیں تمہارے ذہن میں گھٹ کر رہ گئیں ــــ جیسے تمہیں کمرے سے باہر ڈھکیل دیا گیا ہو ــــ ایک سرکاری ڈاکٹر یہی کچھ کر سکتا تھا۔ اس سے زیادہ ہمدردی کرنے کی اُسے اجازت نہیں تھی۔ وہ بچہ پیدا ہونے میں مدد دے سکتا ہے۔ مُلک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لیے آپریشن کر سکتا ہے۔ لیکن ایک بیمار بچے کو موت کے مُنھ سے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ شاید یہ بھی آبادی گھٹانے کی اسکیم کا ایک حصّہ ہے شکنتلا! تمہارا بچہ اِس دُنیا سے زبردستی بھیج دیا گیا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو بڑا ہو کر نہ جانے کیا بنتا ــــ! شاعر، سپاہی، سیاست داں، عالم، فلسفی ــــ!! تم کہا کرتی تھیں اسے میں وکیل بناؤں گی، بڑا ہو کر مقدمے لڑے گا۔ بڑے بڑے مقدمے۔ دُنیا میں نام کمائے گا۔ نام اور روپیہ! کتنی عجیب اور دِل دوز حقیقت ہے کہ آج تمہاری گود خالی ہے۔ کل خالی نہیں تھی۔ لیکن آج خالی ہے۔ اِس وقت وہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہے۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اُسے گہری تاریک قبر میں لٹایا تھا۔ انہی ہاتھوں سے جو اس وقت میرے چہرے کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ تھر تھرا رہے ہیں! جب آخری بار اس کا منھ دیکھنے کے لیے کفن کو منھ پر سے ہٹایا تو شکنتلا میرا جی بھر آیا تھا

وہ بالکل گہری نیند میں سویا جان پڑتا تھا۔ جی چاہا اُسے اُٹھا لوں لیکن انہی ہاتھوں نے، کتنے دوسرے ہاتھوں کے ساتھ مل کر اُس پر منوں مٹی ڈال دی۔ اُسے دفنا دیا ہمیشہ کے لیے اُس کے وجود کو ختم کر دیا۔ گورکن نے اِدھر اُدھر سے بہت سی مٹی جمع کر کے قبر کو سطح زمین سے بہت اونچا کر دیا۔ اور میرے ہاتھ میں ایک سوکھی ٹہنی دیکر کہا ۔۔۔ "اس پر لکھدو ۔۔۔ "رام!" دُکھ اور رنج نے میرے ہاتھ پاؤں کو جیسے بوجھل بنا دیا تھا۔ جانے کتنی مشکل سے میں نے بھگوان کا نام لکھا اور اُسی سوکھی سفید ٹہنی کو قبر کے اوپر گاڑ دیا۔ اور جب سب لوگوں کے ساتھ لوٹ رہا تھا۔ تو میری نظر بار بار پلٹ کر اُس سوکھی ٹہنی پر جا اٹکتی تھی۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی قبروں کے درمیان اُبھری ہوئی وہ ٹہنی کتنی عجیب لگتی تھی۔ جانے وہ ٹہنی میں نے کیوں گاڑی تھی۔ اِس کا جواب آج بھی میرے پاس نہیں ہے۔ تم رو رہی ہو شکنتلا! کیوں؟ رونے سے کیا ہوتا ہے؟ کیا بچھڑنے والے روکر واپس لائے جا سکتے ہیں! اگر کسی نے آج تک مرنے والوں کو واپس بلا لیا ہو تو مجھے بتاؤ۔ نہیں نا! پھر پونچھ ڈالو اِن آنسوؤں کو۔ میں بھی کیسا احمق ہوں، جو بچے کی باتیں لے بیٹھا ہوں۔ کوئی اور بات کہنی چاہیئے تھی۔ شکنتلا میں کتنی دیر سے کئی باتیں سوچنے میں مصروف ہوں لیکن دماغ میں جانے کیوں کوئی اور بات ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ٹکتی۔ دوسرے ہی لمحہ سو دی سامنے آ کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ بچے بھی تو تم جانتی ہو سونے سے پہلے اُسی کی باتیں کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کا دھیان دوسری طرف لے جانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ انہیں کئی نئی نئی کہانیاں سُنائیں لیکن پھر بھی وہ اس بات کو نہیں بھول سکے کہ آج اُن کا ننھا منا بھائی اُنکے درمیان نہیں ہے۔ اُسے میں اور دوسرے لوگ سفید کفن میں لپیٹ کر گھر سے باہر

لے گئے تھے۔ اس گلی سے نکل کر دوسری گلی کی طرف لے گئے۔ یہ بچے چھت پر کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے۔ جہاں تک ان کی نظریں ہمارا تعاقب کر سکیں یہ دیکھتے رہے۔ جب ہم اور اُن کا کفن پوش بھائی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو یہ دوسرے بچوں کے ساتھ باتوں کی عجیب وغریب دُنیا میں کھو گئے۔ کسی نے کہا: "سودی آسمان پر چلا گیا ہے"۔ کسی نے بتایا: "چاند ایک بڑا دیش ہے جہاں بہت سے بچے رہتے ہیں۔ اپنے ماں باپ سے بچھڑے ہوئے بچے واپس آنے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ لیکن اُنہیں لے آنے کے لیے ابھی تک ایسا ہوائی جہاز نہیں بنایا جا سکا ہے جو چاند تک پہونچ سکے۔ جس دن ایسا ہوائی جہاز بن گیا چاند پر گئے ہوئے دُنیا بھر کے بچے واپس آ جائیں گے۔ ایک دن سودی بھی آ جائے گا۔ میں چاہتا تھا کہ بچے مجھ سے کہانیوں کے بارے میں کچھ پوچھیں جو میں اُنہیں سنا رہا تھا۔ لیکن یہ بار بار مجھے بیچ میں ٹوک کر پوچھنے لگتے تھے ـــــ "پتا جی! آپ ہوائی جہاز والوں سے کیوں نہیں کہتے کہ ہمارے سودی کو لے آئیں؟"

"کہوں گا اُن سے"

"آپ اُن سے کیا کہیں گے؟"

"اُن سے کہوں گا ـــــ اب تم سو جاؤ۔ نہیں تو میں اُنہیں کچھ بھی نہیں کہوں گا"۔ تم بھی تو سُن رہی تھیں۔ جب میں نے اُنہیں ایسا کہا۔ تو ونو دنے رو رو کر کہنا شروع کر دیا ـــــ "آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ سُودی کبھی نہیں آئے گا۔ مجھے ڈِنے نے بتایا ہے۔ سودی اب کبھی نہیں آئے گا"۔

"نہیں بیٹا! وہ ضرور آئے گا۔ ڈِنے کو کچھ نہیں معلوم۔ اب تم سو جاؤ ـــــ"

اس وقت میرے بھی آنسو نکل پڑے تھے۔ تم نے بھی رونا شروع کر دیا تھا۔ بچے تو عجیب ہوتے ہی ہیں۔ ایسی اُلٹی اُلٹی باتیں پوچھتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ بڑی مشکل سے انہیں سُلا پایا ہوں۔ یہ تو سو گئے ہیں لیکن خود مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ اب مجھے کون سلائے؟ لگتا ہے آج کی رات آنکھوں میں ہی کٹے گی۔ بجلی کی زرد روشنی میں آج یہ کمرہ کتنا بھیانک معلوم ہو رہا ہے۔ لگتا ہے ہمارے مرحوم بچے کی آتما اس کمرے کے اندر گھوم رہی ہے۔ کوئی ذرا سا کھٹکا ہوتے ہی میں چونک پڑتا ہوں کوئی بچہ اچانک کروٹ بھی بدلتا ہے تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ تم بھی منھ سے کچھ بولو۔ میں چاہتا ہوں میرے ساتھ کوئی باتیں کرتا رہے۔ تم اتنی دور سے مجھے اس طرح کیوں گھور رہی ہو؟ میرے پاس اس پلنگ پر کیوں نہیں آ جاتی ہو؟ یہ پلنگ بہت بڑا ہے۔ ہم پانچوں اس پر بخوبی سو سکتے ہیں۔ وہاں اُس پلنگ پر آج تمہیں نیند نہیں آئے گی۔ جس جگہ پر کسی نے دم توڑا ہو۔ وہاں قدم رکھتے ہوئے بھی جی گھبراتا ہے تم تو بالکل وہیں سو رہی ہو۔ تمہیں ذرا سی بھی وحشت نہیں ہوتی؟ کیا کہا۔ تم ماں ہو —— ہاں، ماں تو ہو ہی۔ مجھے تمہاری کل رات کی بے چینی یاد ہے۔ جب سودی تمہاری گود میں لیٹا ہوا تھا۔ تم اُس کے ماتھے کو بار بار چھوتی تھیں۔ بار بار —— میں تمہیں کتنی بار کہہ چکا تھا۔ اسے گود سے اُتار کر پلنگ پر لٹا دو۔ گود میں بہت دیر اُٹھائے رہنے سے بچہ بھی گھبرا جاتا ہے۔ لیکن تمہاری تو ممتا تڑپ رہی تھی! تم میرا کہا کیوں مانتیں؟ تمہیں اپنی ضد پر اڑا ہوا دیکھ کر میں جانے کب سو گیا اور تم بھی سو گئیں! جانے کب سودی کو گود میں سے اُتارا۔ تم نے اسے سویا ہوا سمجھ کر گود میں سے اُتار دیا۔ کئی راتوں سے جاگتے رہنے کی وجہ سے تم خوب گہری نیند

سوگئیں۔ اور ہمارا شیر خوار بچہ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی جگائے بغیر ہمارے سے چلا گیا
جانے اُس نے تمہاری طرف آخری بار کس بےچینی سے دیکھا ہوگا۔ اُس نے آخری ہچکی
کتنی تکلیف سے لی ہوگی۔ جانے اُس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے تمہیں جگانے کی کوشش
بھی کی ہو۔ تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوا۔ صبح چھ بجے میری آنکھ اچانک کھُل گئی تھی۔
اپنے لحاف میں سے سر نکال کر تم دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ تم دونوں کو سویا ہوا پاکر
قدرے اطمینان ہوا تھا۔ میں اُٹھ کر تمہارے پلنگ کے پاس بھی آیا تھا۔ بچّے کے ماتھے
کو بھی چھوا تھا۔ صرف ماتھے ہی کو چھوا تھا۔ بہت زیادہ ٹھنڈا نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے
ابھی ابھی بخار اُترا ہو۔ اُس کے چہرے کو بھی خاص غور سے نہ دیکھا۔ تمہیں جگا کر
ناشتہ تیار کرنے کے لیے باہر بھیج دیا۔ اور سودی کو رضائی کے اندر اور اچھی طرح سے
ڈھانپ دیا کہ اُسے ہوا نہ لگے۔ تم ناشتہ تیار کرتی رہیں میں دفتر جانے کے لیے تیار
ہوتا رہا۔ سودی کے پلنگ کے پاس میز کھینچکر وہیں ناشتہ کیا۔ یہی اطمینان تھا کہ
سودی سو رہا تھا۔ اُس کا بخار اُتر چکا تھا۔ میری چنتا دور ہو چکی تھی۔ یہ معلوم نہیں تھا
کہ وہ اُسوقت اِس دُنیا میں موجود ہی نہیں تھا۔ میں اُس کی موت پر آنسو بہانے
کے بجائے گرم گرم ناشتہ کرتا رہا۔۔۔ اور تم ۔۔۔ تُم شکنتلا تم بھی تو بیوقوف ہی
نکلیں۔ بچّے کو سویا ہوا سمجھ کر تم نے بھی سوچ لیا۔ آج گھر کے سب کام پورے کر ڈالونگی
کئی دنوں سے جمع پڑے ہوئے میلے کپڑے بھی جیسے اُسی دن دھونے تھے۔ گھر بھر کے
کونے کونے سے کوڑا بھی اُسی روز سمیٹنا تھا۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ ایک لمحہ کے لیے تو جا کر
اُسے دیکھ لیا ہوتا! کل تک وہ تمہاری گود سے اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آج تمہاری
ممتا اُس کے لیے ذرا بھی نہ تڑپی؟ اگر شیل نے اُسے جاکر نہ دیکھا ہوتا اور اُس کھا بالکل

نہ ملنے جلنے کی تمہیں اطلاع نہ دی ہوتی تو تم اپنے کام کاج میں مصروف رہتیں! شکنتلا، تم نے پھر رونا شروع کر دیا ہے؟ ہاں، میں ہی تو تمہیں رُلا رہا ہوں۔ پاگل ہو گیا ہوں نا! جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا نا۔ کہ نیند نہ آنے کی وجہ سے میرے دماغ میں عجیب عجیب سے خیالات گُھسے چلے آرہے ہیں۔ آج مجھے نیند نہیں آئیگی تم اگر یہاں آجاؤ اور کچھ باتیں کرو تو شاید دھیان کسی دوسری طرف چلا جائے اور پھر نیند آجائے — کیا کہا — "بُری بات ہے" — لیکن میرے دل میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ خیر تم جانو — مجھے تو دماغی سکون کی ضرورت ہے۔ کسی طرح بھی مل جائے رات تو جیسے تیسے کٹ ہی جائے گی۔ انتہائی دُکھ یا سُکھ کو میاں بیوی ہی آپس میں بانٹتے ہیں تیسرا کوئی نہیں ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ گلے ملنے سے بہت اطمینان ملتا ہے۔ یہ خالص نفسیاتی نکتہ ہے۔ تم اسے نہیں سمجھتی ہو۔ اِسوقت میرے اور تمہارے درمیان ہندوستانی تہذیب کی دیوار آکر کھڑی ہو گئی ہے اگرچہ اِس دیوار کو ہم دو کے سوا دیکھنے والا اِسوقت اور کوئی نہیں لیکن تم تو بالکل ہی دوسرا مطلب سمجھ بیٹھی ہو۔ خیر ٹھیک ہے اگر غلط بھی سمجھ لیا ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور! قصور ہماری تہذیب کا ہے۔ ہمارے رسم و رواج کا ہے۔ ہم ہندوستانی میاں بیوی ایک دوسرے کے سینے کے ساتھ ایک ہی وقت لگتے ہیں۔ ایک ہی مطلب سے۔ ایک ہی خیال سے۔ جب ایک دوسرے سے صرف جسمانی طور پر ملنا ہو — خالص جسمانی طور پر — ویسے بالکل نہیں۔ تمہیں یہ بات سمجھانا مشکل ہے۔ تمہارے خیال کو بدلنا بھی مشکل ہے۔ تم اپنے غم سے اِسقدر دبی ہوئی ہو کہ تمہارے لیے میری بات کی طرف پوری توجہ دینا بھی مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم اب میری کوئی بات بھی نہیں سنوگی۔ تم نے میری باتوں سے

پریشان ہو کر منہ پھیر لیا ہے۔ اب میں پھر اکیلا رہ گیا ہوں۔ اس زرد ۔۔۔ موت جیسی زرد روشنی سے بھرے ہوئے کمرے میں بالکل تنہا ۔۔۔ ابھی اڑھائی ہی بجے ہیں۔ کتنی دیر ہو گئی ہے۔ سوچتے ہوئے آدھا گھنٹہ ہی گذرا ہے۔ آج اس ٹائم پیس کو کیا ہو گیا ہے۔ گیارہ بجے میں نے سودی کی موت کی خبر سیتا پور بھجوا دی تھی۔ اس وقت اتفاق سے میرا پڑوسی سیتا پور جا رہا تھا۔ میری چھوٹی بہن اس خبر کو سُن کر کس قدر دُکھی ہو گی ایک لمحہ چین سے نہیں بیٹھے گی۔ فوراً لکھنؤ آنے کے لیے بیقرار ہو اٹھیگی اسوقت تک اُسے اطلاع مل چکی ہو گی۔ اس وقت وہ گاڑی میں ہو گی۔ یہاں گاڑی چار بجے پہنچتی ہے۔ پانچ بجے تک وہ ہمارے پاس پہنچ جائے گی۔ ایک مہینہ پہلے وہ سودی کو ہنستا کھیلتا ہوا چھوڑ گئی تھی وہ کتنی خوش تھی۔ سودی کی پیدائش کی خوشی میں میں نے اُسے نئے کپڑے بنوا دیے تھے۔ ان کپڑوں کو دیکھ کر وہ کتنی دُکھی ہو گی اُسے ہمیشہ سودی کی یاد آئے گی۔ شکنتلا! شکنتلا سو گئی ہے۔ اُدھر دیوار کی طرف منھ پھیر کر لیٹی ہوئی ہے میری کسی بات کا جواب نہیں دیتی اُسے نیند آ رہی ہے۔ میں کس کے ساتھ باتیں کروں؟ اُسے ساتھ سُلانے سے میرا مقصد محض خیالات کو دوسری طرف لے جانا تھا۔ اس طرح سوچتے سوچتے مجھے گھبراہٹ بہت ہونے لگی ہے۔ دن میں مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ دن بھر میرے چہرے پر کسی نے غم کی لکیریں نہیں دیکھیں۔ جو لوگ سودی کی موت پر اظہار افسوس کے لیے آئے تھے وہ مجھے نارمل دیکھ کر حیران ہوتے تھے میں اُن کے ساتھ تازہ خبروں اور پرتھوی تھیٹرز کے نئے ڈراموں پر بحث کرتا رہا جیسے میرے گھر میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ آنے والے رات کے گیارہ بجے تک آتے رہے جب سب چلے گئے تو گھر کی کیفیت ہی جیسے بدل گئی۔ شکنتلا دن بھر روتی رہی تھی۔

تنہائی محسوس کرکے پھر رونے لگی۔ اُسے کچھ دلاسا دیا تو بچّوں کے عجیب و غریب سوالوں نے گھیر لیا۔ اب نچّے بھی سوئے ہوئے ہیں۔ شکنتلا بھی سوئی ہوئی ہے۔ کمرے کے اندر دہشت سی بھری ہوئی ہے۔ اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھنے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ اسی نچّے کے خیال سے دل دھڑکتا ہے۔ جسے کل تک سینے سے لگا رکھا تھا آج اُس کے تصوّر سے روح کانپ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے گھر سے باہر چلا جاؤں۔ اِن سب کو چھوڑ کر اسوقت کہاں جاؤنگا اسوقت میرا جی کون بہلائے گا۔ کس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں؟ آج دِن میں جب سودی کی لاش بازوؤں پر اُٹھائے اپنے محلے سے ملحق کسی دوسرے محلّے سے گذر رہا تھا تو ایک مکان کی کھڑکی میں سے ایک نہایت ہی خوشنما چہرہ تیچے جھانک رہا تھا۔ بیحد خوشنما۔ دو لمبی سیاہ چوٹیاں، دو گہری سیاہ آنکھیں؟ اُس وقت میرے بازوؤں پر لاش نہ ہوتی تو اُسے میں جی بھر کر دیکھتا۔ کبھی کبھی کوئی شکل ایسی سامنے آجاتی ہے جسے دیکھ کر انسان جینے کی آرزو میں کھو جاتا ہے۔ انسان کتنا عجیب ہے۔ موت، حُسن، زندگی۔ موت حُسن! آرزو۔ جینے کی آرزو۔ کاش اسوقت وہ عورت میرے سامنے ہوتی۔ میں موت کی اس دہشت کو بھول جاتا جو اس کمرے میں میرے اِرد گرد رینگ رہی ہے۔ موت کا خوف اس قدر غالب ہے کہ میں اُس خوبصورت چہرے کو بہت جلد بھول جاتا ہوں۔ پھر سوچنے لگتا ہوں۔ پھر دیکھنے لگتا ہوں میرا بچہ قبر کے اندر لیٹا لیٹا مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگتا ہے میری طرف دونوں ہاتھ بڑھاتا ہے۔ چاہتا ہے میں اُسے اُٹھالوں اُسی لمحہ ونود نیند میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر سودی کا نام ہے۔ کہیں وہ چلّانا نہ شروع کر دے۔ شکنتلا! آج تم میری مدد نہیں کرتیں؟ کب تک نہیں کروگی؟ کب تک اس غم کو طاری کیے رہوگی۔ تم کتنی عجیب عورت ہو! وہ عورت بھی کتنی عجیب تھی۔ جو

بیحد خوبصورت تھی۔ بیحد دلکش تھی۔ میں اُسے پھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُسے ایک بار پھر دیکھنے کی آرزو ہے۔ کسی کو دیکھنے کی اتنی شدید خواہش میرے دل میں پہلے کبھی موجود نہیں رہی ہے، ہاں موجود رہی ہے ایک عورت اور بھی ہے جسے مرنے سے پہلے صرف ایک بار دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ رانی! چودہ سال گزر گئے ہیں۔ اُسے پھر نہیں دیکھا وہ ایسی خوبصورت تو نہیں تھی پھر بھی مجھے اچھی لگتی تھی۔ جانے کیوں! شاید اس لیے کہ میں نے زندگی میں پہلی محبت اُس سے کی تھی پہلا پیار کبھی نہیں بھولتا پہلی محرومی کا زخم ہمیشہ ہرا رہتا ہے جانے وہ کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی؟ کتنے بچوں کی ماں ہوگی کیا وہ زندہ بھی ہوگی۔ ممکن ہے ' ہوا۔ ونود اُٹھ بیٹھا ہے۔ اچانک اُٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہا ہے؟ ونود! بیٹا ونود!! کیا بات ہے؟ تم پلنگ سے نیچے کیوں اُتر رہے ہو؟ یہاں آؤ۔ باہر مت جاؤ —— کیا؟ باہر سودی بلا رہا ہے؟ کہاں؟ کہاں؟ ونود کے زور زور سے رونے کی آواز سُن کر شکنتلا بھی چیخ مار کر اُٹھ بیٹھی ہے۔ میں شیل اور کرن کو سنبھالنے لگتا ہوں کہیں وہ بھی نہ جاگ جائیں۔ اُن دونوں کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے شکنتلا سے کہتا ہوں۔ بس اب خاموش ہو جاؤ نہیں تو یہ بھی جاگ جائیں گے۔ شکنتلا خاموش ہو جاتی ہے۔ ونود کو اپنے ساتھ لپٹا کر سسکنے لگتی ہے۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں —— سو جاؤ شکنتلا! شکنتلا لیٹ جاتی ہے۔ ونود کو سینے سے چمٹا کر —— میں بھی اپنے لحاف میں پھر سرک جاتا ہوں۔ اور چھت کی طرف دیکھتا ہوں۔ بجلی کی زرد روشنی سے رنگی ہوئی چھت پر جہاں سے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ماضی کی ایک بھولی بسری یاد کریدی تھی۔ ایک لڑکی کا تصور کر کے اس غم اور خوف سے بھرے ہوئے

ماحول سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ونود کے جاگ جانے سے ایک لمحہ میں ماحول پھر بدل گیا ہے۔ مجھے پھر خوف محسوس ہو رہا ہے۔ مرحوم بچے کا چہرہ پھر سامنے آ گیا ہے۔ گذشتہ دن کا پورا واقعہ نظروں کے سامنے گھومنے لگا ہے۔ یہ واقعہ میں نے آج کتنی بار دیکھا ہے۔ یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے مٹتا کیوں نہیں؟ میں اپنے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہوں۔ میرے جسم کے رونگٹے ابھی تک کھڑے ہیں۔ میں اپنے پورے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہوں۔ یہ بات اچھی نہیں ہے۔ لیکن میں کیا کروں میرا جسم جیسے سو چکا ہے۔ میرے ہاتھ کے لمس سے بیدار نہیں ہوگا۔ جانے آج مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے خوف کیوں لگ رہا ہے۔ اپنے بچے سے خوف۔ بچہ جواب یہاں ہے ہی نہیں۔ میں اُس کی موت کا ذمہ دار تھوڑی ہوں۔ جو ذمہ دار ہیں وہ تو گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ خوب گہری نیند۔ صبح اُٹھ کر وہ پھر کسی ماں کا پیٹ چاک کریں گے۔ پھر کسی رگ کو کاٹیں گے پھر کسی ماں کی تخلیق کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے گا ایک اور عورت ماں بننے کے فخر سے محروم کر دی جائیگی اپنے چند بچوں کا پیٹ نہ بھر سکنے پر اُسے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا کرانے کے بعد وہ بچے بھی اُس کے پاس نہ رہیں۔ کسی کو کیا معلوم! سو جی کیوں چلا گیا؟ میرے باقی بچوں کی زندگی کی ذمہ داری کون لے گا؟ کون لے سکتا ہے؟ شکنتلا کو اسی بات کی چنتا ہے لیڈی ڈاکٹر کے کہنے میں آ کر اُس نے آپریشن کرا ڈالا۔ لیڈی ڈاکٹر تو ایک پنج سالہ پلان کے تحت زیادہ سے زیادہ آپریشن کر رہی ہے۔ اُسے تو آبادی روکنے میں ہاتھ بٹانا ہے۔ آبادی کو کم کرنے میں۔ آبادی کو قائم رکھنے میں نہیں! وہ عورت شکنتلا سے کیا کہہ رہی تھی۔ میں اُس وقت اُسے روکنا چاہتا تھا۔ میں اُسے کچھ نہ کہہ سکا۔ اُس نے

شکنتلا کے دل میں انتہائی خوف پیدا کر دیا ہے۔ اُسے بھگوان کے قہر سے ڈرا لیے بچے بھگوان و تیلے ہے۔ بچے پیدا ہونے سے روکنا بھگوان کو ناراض کرنا ہے۔ بیں یہ نہیں مانتا۔ پھر بھی باقی تین بچوں کی زندگی کی گارنٹی چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اُنکی ٹھیک طرح دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی ذمّہ دار ہونا چاہیئے۔ کل کسی سے کہوں گا۔ کسی کو اخبار میں دینے کے لیے کہوں گا میں خود ہی لکھوں گا۔ ملک کے نیتاؤں کو لکھوں گا۔ شکنتلا سنو! میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تم نہیں سنوگی۔ میں تم سے ایک بالکل نئی بات کہنا چاہتا ہوں۔ کیا تم سچ مچ سو گئی ہو؟ — شکنتلا سو رہی ہے۔ آنکھیں بند کیے۔ ونود کو اپنے ساتھ چمٹائے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ لیکن میرے بدن میں اُٹھ کر بیٹھنے کی کچھ ہمت پیدا ہو گئی ہے میں شکنتلا سے یہ بات ضرور کہوں گا میں اس خوف کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ جو اس کمرے میں کتنی دیر سے موجود ہے۔ ونود دھیر بڑبڑانے لگا ہے۔ اُسے نیند نہیں آسکتی۔ جس جگہ وہ سو رہا ہے وہ اُس کے مرحوم بھائی کی جگہ ہے۔ کل وہ اسی جگہ پر سویا ہوا تھا۔ اس کی روح کتنی بیقرار ہوگی۔ وہ اپنی ماں کی گود میں کسی دوسرے بچے کو دیکھ کر رونے لگتا تھا۔ ونود کو اپنے پاس سُلانا ہی ٹھیک ہوگا۔ میں ہولے سے کھنکارتا ہوں۔ میرے کھنکارنے پر جیسے کمرے کی ہر چیز پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ میں پیٹ پر اکٹھا ہو گئے ہوئے سوئیٹر کو نیچے کی طرف کھینچتا ہوں۔ پلنگ سے نیچے اُتر کر فرش پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ فرش بہت ٹھنڈا ہے۔ دینوں کی ٹھنڈک میرے پیروں میں گھس رہی ہے۔ سردی سے میرا بدن کانپ رہا ہے۔ ونود کو اُٹھا کر میں اپنے پلنگ پر لے آتا ہوں شکنتلا کو خبر تک نہیں ہوتی وہ سوئی ہوئی ہے ضرور کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اس کے لب کپکپا رہے ہیں۔ ابھی اُٹھ کر نہ بیٹھ جائے۔

میں اُس کے بھیانک خواب کو جانتا ہوں۔ اب وہ ہمیشہ ایسے ہی خواب دیکھے گی اس کے لیے مجبور ہو گی۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میرے پاس ہے کیا؟ اُس کے ذہن سے ڈر اور خوف دور کرنے کے لیے میں کچھ سوچوں گا ضرور اُسے ہمیشہ ایسی کیفیت میں نہیں رکھ سکتا۔ میں اُس پر جھک کر اُسے دیکھتا ہوں۔ اُس کے لب ابھی تک کپکپا رہے ہیں۔ میں جاگتے ہوئے ڈر رہا ہوں وہ نیند میں ڈر رہی ہے۔ ڈرنا اچھی چیز نہیں ہے۔ اس ڈر کو ختم ہونا چاہیے۔ میں اُس پر جھک جاتا ہوں۔ اس کے کپکپاتے ہوئے لبوں پر اپنا منھ رکھ دیتا ہوں۔ چاہتا ہوں اُسے میں اپنے بازوؤں میں لیلوں خوب زور سے اپنے ساتھ بھینچ لوں۔ تاکہ اُس کا سارا خوف دور ہو جائے۔ لیکن وہ جاگ اُٹھتی ہے۔ جان جاتی ہے۔ میرے منھ پر ہاتھ رکھ کر مجھے زور سے پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ منھ سے کچھ نہیں کہتی۔ گھور گھور کر دیکھنے لگتی ہے۔ بڑی بڑی حیران آنکھوں سے۔ اس کی خوبصورت کالی آنکھوں میں میں نے پہلے کبھی ایسی کیفیت نہیں دیکھی تھی جانے یہ کیفیت کیسی ہے؟ غصّہ تو نہیں ہے؟ اس کا غصّہ میں اچھی طرح پہچانتا ہوں نفرت بھی نہیں ہے وہ بالکل بے حس و حرکت پڑی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ لگتا ہے میں نے کسی بے جان عورت کو بوسہ دیا ہے۔ جس کی آنکھیں یکایک کھل گئی ہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں خوف سے لرزتا ہوں۔ اپنے بستر پر جا لیٹتا ہوں۔ وہ ابھی تک گردن گھمائے میری طرف دیکھ رہی ہے مجھے شکنتلا سے ڈر لگ رہا ہے۔ جیسے وہ شکنتلا نہیں ہے۔ میری بیوی نہیں ہے۔ میری عورت نہیں ہے میرے بچوں کی ماں نہیں ہے کوئی دوسری ہی عورت ہے جسے میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ میرے کمرے میں پہلے کی نسبت کئی گنا زیادہ ہیبت پیدا ہو گئی ہے۔ میرے لیے تو سانس لینا بھی دوبھر

ہو رہا ہے۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہے۔ میرے ہاتھوں میں اتنی بھی سکت نہیں رہی ہے کہ اس عورت کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اپنے چہرے پر لحاف ڈال سکوں — اچانک دروازے پر دستک سُنائی دیتی ہے۔ ایک دستک اور رونے کی آواز! کون ہے؟ کون رو رہا ہے؟ میرا دل اُچک کر حلق میں آجاتا ہے رونے کی آواز آتی رہتی ہے۔ اس آواز کو شکنتلا بھی سُن رہی ہے۔ وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ اس کی کیفیت بھی بدل گئی ہے۔ اور اب پہلے کی طرح بے حس و حرکت نہیں رہی ہے۔ چارپائی سے سر اُٹھا کر اُس آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتی ہے یکایک میں بھی اس آواز کو پہچان لیتا ہوں۔ ہم دونوں کے منھ سے ایک ساتھ نکلتا ہے — موتیا آئی ہے — میری بہن — میری چھوٹی بہن اپنے بھتیجے کا ماتم کرنے کے لیے آپہنچی ہے۔ میری نظریں ٹائم پیس کی طرف اُٹھ جاتی ہیں پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ میں تڑپ کر پلنگ سے نیچے اُتر آتا ہوں شکنتلا پھر رونے لگتی ہے۔ زور زور سے رونے لگتی ہے۔ میں جلدی جلدی بھاگتا ہوں اور دروازہ کھولنے چلا جاتا ہوں۔ موت کی خوفناک پرچھائیں جانے کہاں اُڑ گئی ہے — !

اِبہا

۱۹۵۹ء

اس بار ابھّا آئی تو پہلے سے بہت مختلف تھی۔ بہت ہی بدلی ہوئی۔ اُس کا خوبصورت اونچا متناسب جسم جگہ جگہ سے بھر گیا تھا جسم کی جن خوبصورت قوسوں کی وجہ سے اُس کی طرف ہر وقت دیکھتے رہنے کو جی چاہا کرتا تھا اپنی ساری کشش اور رعنائی کھو چکی تھیں رخساروں کے نازک گڑھوں میں بھی اس بے رحمی سے گوشت اُبھر آیا تھا کہ ان کے ساتھ اُسکی خوبصورت ناک کی ساری مناسبت ختم ہوگئی تھی۔ نتھنے کچھ پھول گئے تھے۔ ناک کی نوک پر ایک گہرا سُرخ نشان پڑا ہوا نظر آتا تھا۔ اور سر کے بال ——— ! چندر لیکھا کو میں ہمیشہ یہ کہہ کر چڑایا کرتا تھا: دیکھو ابھّا کے بال تم سے زیادہ لمبے اور خوبصورت ہیں! اور اُس نے تنگ آکر اپنے کم لمبے بال ترشوا کر انہیں بیحد جاذب نظر بنا لیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ابھّا کے بالوں کے جنگل پر سے جیسے کوئی بہت بڑا طوفان گذر گیا تھا جو اس کے سارے پھول، ساری خوشبوئیں، ساری رعنائیاں اپنے ساتھ اُڑا لے گیا تھا رہ گئے تھے گنتی کے کچھ بال جن سے وہ بڑی مشکل سے چھوٹا سا ایک جوڑا بنا پاتی تھی۔ چھ سال کی ازدواجی زندگی نے اُسے دو بچّے بھی دیدیے تھے۔

اُس کے اندر صرف جسمانی تبدیلی ہی ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر بھی آگے بڑھنے کی بجائے جانے کہاں رُک کر رہ گئی تھی۔ کونسی غلط سمت کو گھوم گئی تھی کہ اب اُس کی باتوں میں نہ شعر و ادب کا ذکر ہوتا نہ نئی پروگریسو فلموں کے بارے میں

اُس کی رائے ملتی اور نہ ہی کوئی ایسی بات ملتی جس کی وجہ سے اُسے ہمیشہ اپنے پاس بٹھائے رہنے کی ترغیب ملتی تھی۔ اب تو بس لے دے کر اُس کے پاس اپنے ساس سُسر اور شوہر کی باتیں رہ گئی تھیں جنہیں سنتے سنتے کان پک گئے۔ میرے لیے سب سے بڑا صدمہ یہی تھا۔

وہ دو سال بعد میکے آئی تھی۔ شادی کے بعد ایک لڑکی کے لیے میکہ بھی بڑی آرزوؤں کا مرکز ہوتا ہے۔ وہ میکہ کے بارے میں دل میں بڑے فخر و غرور کا احساس رکھتی ہے۔ سُسرال میں کسی بات پر چوٹ کھاتی ہے تو اُس وقت وہاں سے روٹھ کر جانے کی جگہ وہی میکہ ہوتا ہے جسے شادی سے پہلے چھوڑ جانے کے لیے وہ کیسے کیسے خواب نہیں دیکھتی۔ لیکن ابھا اور چندر لیکھا کے میکے کے بارے میں ایک دردناک حقیقت یہ بھی تھی کہ وہاں ان کے پتا نہیں تھے وہ عرصہ ہوا فوت ہو چکے تھے۔ ایک ادھیڑ ماں تھی، دو بھائی تھے۔ چھوٹا ابھی پڑھ رہا تھا۔ بڑا بھائی سود پر روپیہ دینے کا دھندا کرتا تھا اس کے پانچ بچے تھے اور ایک بیوی۔ سخت چڑچڑی، بات بات پر کُڑھنے والی سارے گھر کی باگ ڈور اُسی کے ہاتھ میں تھی۔ اُس کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ اُس کا شوہر تک دبتا تھا۔ دن بھر کماتا۔ بھوکا پیاسا رہتا۔ کبھی کبھی اُسے جان تک کے خطروں میں گذرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی کیا مجال کہ اپنی ذات پر بیوی کی اجازت کے بغیر ایک پیسہ تک خرچ کر جائے۔ اُس کی بیوی کی تنگ دلی اور زبان کی بے لگامی کی داستانوں میں ایک یہ واقعہ بھی تھا کہ آج سے کچھ سال پہلے اُس نے میری بیوی کے بارے میں لوگوں سے کہا تھا: "چندر لیکھا تو ہمیں لوٹ لوٹ کر کھا جانا چاہتی ہے۔ جب دیکھو میکے چلی آ رہی ہے۔ ساتھ ساتھ فرمائشوں کی پوری

فہرست، مجھے یہ بھی چاہیے مجھے وہ بھی چاہیے" اور نہ جانے اُس نے کیا کیا نہ کہا۔ میرے جیسے خوددار شوہر کے لیے یہی مناسب تھا کہ اِن کے ہاں آنے جانے کا سلسلہ منقطع کر دیتا تھا۔ چندر لیکھا کو بھی یہی کرنا چاہیے تھا لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے عورت کا دل میکے میں رہتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ وہاں کبھی کبھی جاتی تھی لیکن ایک زخمی احساس کے ساتھ۔ اس کے اندر کے جذبات میں اس کے چہرے سے صاف صاف پڑھ سکتا تھا۔

اس بار اِبھا کے میکے میں آنے کی داستان بھی بہت عجیب تھی۔ چندر لیکھا سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُس نے اپنی بھابی کو خط لکھا تھا جس میں اُس سے درخواست کی تھی کہ وہ اُس کے سسرالی والوں کو لکھ کر اُسے اپنے ہاں بُلائے۔ اس کا جی بہت اُداس تھا اُسکی بھابی نے اُسے بلانے کے مسئلے پر سوچ بچار کرتے کرتے کئی مہینے گزار دیے اور جب بالآخر وہ بُلائی گئی تو اُس کے آنے سے پہلے اُس خط کا حال اُن کے ہر ایک ملنے جلنے والے کو معلوم ہو چکا تھا۔

بیاہی ہوئی بیٹی جب سسرال سے آتی ہے تو اپنے چھوٹے بھائی بہنوں، بھتیجے بھتیجیوں، بھانجے بھانجیوں غرض ہر چھوٹے بچے کے لیے کوئی مناسب کپڑا، کھلونا وغیرہ لے آتی ہے۔ اس میں لڑکی کی ذاتی شان کے علاوہ اُس کے سسرال والوں کی شان بھی ہوتی ہے۔ ایسے رکھ رکھاؤ اور لوک لاج کی باتیں ہندوستانی سماج میں بہت پُرانی ہیں۔ کچھ لوگ اپنے حالات کی وجہ سے اِنہیں پورا نہیں کر سکتے۔ پھر بھی ناک اونچی رکھنے کی خاطر کسی نہ کسی طرح نبھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اِبھا کے سسرال والے تو خیر اچھے کھاتے پیتے تھے۔ اس کا شوہر اور سُسر دونوں کماتے تھے

ڈ جو کچھ بھی لے آئی تھی۔ گلی محلے کی عورتوں کو دکھانا بھی ضروری تھا۔ عورتیں خود دیکھنے کے لیے آئی تھیں اور پھر سارا حال دوسری عورتوں کو جاسُنا یا تھا کوئی اپنی حیثیت سے بڑھ کر لے آئے تو اُس کی تعریف ہوتی ہے۔ کوئی کم لائے تو اس پر نام دھرا جاتا ہے ناک پر انگلی رکھ کر حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ایک دن میں دفتر سے لوٹا تو اپنی سب سے چھوٹی بچی اُبھا کے ہاتھ میں ایک نئی قسم کا کھلونا دیکھا۔ چابی سے چلنے والی ایک سکول بس تھی مجھے دیکھ کر اُبھا نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس میں چابی بھری اور پھر ہنستے ہنستے فرش پر دوڑا یا۔ مجھے بتایا یہ اسکے لیے اُس کی موسی ابھا لے آئی تھی ناگپور سے۔ میں نے اُسکی خوشی کی تائید کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔ کھلونے کو اُٹھا کر دیکھا بہت اچھی کمپنی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا پانچ سے کم میں نہیں آیا ہوگا۔ میں نے چندر ریکھا کے سامنے اِس کی قیمت کا اندازہ لگایا

چندر ریکھا نے میرے اندر پہنچتے ہی بہت ساری چیزیں میرے سامنے پھیلا دیں۔

یہ اشوک کی نیکر اور بش شرٹ ہے۔

یہ ریکھا کے لیے تین فراک ہیں۔

یہ اُبھا کے لیے، تین فراک، دو سوئیٹر، گرم جرابیں، بوٹ اور دس روپے!

میں نے گھبرا کر پوچھا ـــــ "یہ سب کیا ہے آخر!"

وہ ہنسکر بولی: "ابھا لے آئی ہے۔ میں نے تو اُسے کہا اتنا لانے کی کیا ضرورت تھی میں سب نہیں لے سکتی" لیکن وہ زبردستی رکھ کر چلی گئی کہتی تھی "پھر کچھ کہا تو اچھا نہیں ہوگا!"

میں نے چندر ریکھا کے چہرے پر گہری نظر ڈالی۔ تیس برس کی اکثر خاموش اور متفکر رہنے والی عورت اسوقت مُسکرا رہی تھی۔ مجھے اسکی مُسکراہٹ ہمیشہ اچھی لگتی ہے

کیونکہ وہ کبھی کبھی ہی مُسکراتی ہے۔ لہٰذا کوئی دلشکنی کی بات کہنے کی بجائے میں نے کہا "چائے بناؤ، جلدی ——! بہت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔" اور کپڑے بدل کر کرسی میں جا بیٹھا، صبح کا باسی اخبار دیکھنے کے لئے۔

میرے ساتھ چائے پیتے پیتے یہ بات اس نے خود ہی چھیڑ دی "جتنا لائی ہے اُس سے زیادہ لے بھی تو جائے گی —— اچھا!"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چائے پیتا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس کے چہرے پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ کے نیچے جو فکروں کی لکیریں چھپ گئی تھیں اب پھر جھلک رہی تھیں۔

"سو روپوں کا خرچ تو سر پر آ ہی گیا ہے اب!"

میں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اور اس نے یہ کہہ کر بات کا رُخ خود ہی پلٹ دیا "دیکھوں گی بھابی سے کیا لے جاتی ہے وہ!"

میں نے صرف اتنا کہا —— "تم لوگوں کی بھابی بھی تو بہت امیر ہے۔ موٹروں اور لڑکوں کی مالک ہے وہ جتنا بھی دے کم ہے!"

"خاک!" چندر لیکھا نے چمک کر کہا "جیسے میں اس کا مزاج جانتی نہیں ہوں۔ وہ تو آجکل اس بات کے لیے بھی انگاروں پر لوٹ رہی ہے کہ اِبھا کے بچے روزانہ ایک سیر دودھ پی جاتے ہیں!"

دوسرے دن اِبھا آئی تو بھابی کی شکایت کرنے لگی "عجیب عورت ہے!۔ میرے آتے ہی گھر کے سب خرچ تھوڑے گھٹا دیے ہیں۔ ترکاری کم بنواتی ہے۔ چائے کے ساتھ ناشتہ بند کر دیا ہے۔ اس کے بچے روتے رہتے ہیں۔ پہلے

ایک ٹائم دال بنتی تھی اب دونوں وقت بنتی ہے۔ رات کو بھیا کچھ فروٹ لے آئے تھے اُن کے ساتھ لڑ پڑی: "تم تو بہت ہی فضول خرچ ہو گئے ہو! ذرا نہیں سوچتے! میرا جی تو چاہا منھ پر کہدوں" کیا ہوا بھابی اگر بھیا فروٹ لے آئے تو۔ آخر میرا بھی اس گھر پر کچھ حق ہے۔ میں بھی کچھ اُمید لے کر یہاں آئی ہوں!" لیکن پھر سوچا۔ کون ما تھا مارے اس کے ساتھ۔ خواہ مخواہ بات بڑھ جائے گی۔"

بات تو واقعی بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اچھا جب بھی تیسرے چوتھے دن ہمارے ہاں آتی بھابی کے کسی نہ کسی نئے جھگڑے کی خبر لے کر آتی ——— "آج بھیا کھانا کھا کر نہیں گئے۔"

"رات کو بہت دیر تک، ایک دوسرے کو بھلا بُرا کہتے رہے۔ بھیا کہتے تھے میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اگر تم اپنا سوبھاؤ نہیں بدلوگی تو۔ اس کا کہنا تھا تم اپنی عادتیں بدلو بہت خرچ نہ کیا کرو۔ روز کپڑے نہ بدلا کرو۔ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو چائے نہ پلانے پھرا کرو، وہ ان کے رات کو دیر سے آنے پر بھی الجھتی ہے۔ اُسے شک ہے کہ وہ ضرور کہیں آتے جاتے ہیں۔ کمائی کا بہت سارا حصّہ وہیں چلا جاتا ہے۔ لیکن بہن! بھگوان کے لیے بھابی سے نہ کہہ دینا نہیں تو ———"

"ارے نہیں اچھا! تم بھی کیا سوچتی ہو۔"

میری بیوی نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ پھر بھی وہ بولی "قسم کھاؤ"

"لو کھائی قسم۔ بس!"

دونوں ہنسنے لگیں۔

ایک دن مجھے ایک سینما کا فری پاس مل گیا۔ گھر پہونچکر چندر ریکھا کو بتایا

تو وہ کہنے لگی۔

"اِبھا کو بھی لے چلیں۔ وہ بچاری بھابی کے پاس بہت پریشان رہتی ہے۔ چند گھنٹے ہمارے ساتھ ہنسی خوشی گذارے گی۔"

جی تو میرا بھی چاہا اُسے لے چلوں۔ لیکن یہ سوچکر دل ڈوب گیا کہ پاس پر صرف پانچ آدمی لکھے تھے۔ اور ہم سب بچوں سمیت پانچ تھے۔ اِبھا کو ساتھ لیجا کر اُس کے ٹکٹ کے دام بھی جیب سے خرچنے ہوں گے، جب اِس صورتِ حال سے بیوی کو متنبہ کیا تو وہ بولی ——— "کوئی بات نہیں ایک ہی ٹکٹ کی تو بات ہے۔"

میں نے کہا ——— "پاس اوپر گیلری کا ہوتا ہے وہاں کا ٹکٹ تین روپے بارہ آنے کا ہے۔"

چندریکھا بہت ذہین بھی ہے۔ جھٹ سوچکر بولی ——— "ہم سب اوپر گیلری میں رہیں گے آپ بارہ آنے کا ٹکٹ لے کر نیچے جا بیٹھیے گا۔"

واقعی ایک صورت تو نکل ہی آئی تھی لیکن یہ سوچکر دل بہت اُداس ہوا کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ نہیں بیٹھوں گا۔ اِبھا کو بلایا گیا وہ آئی اور مفت سینما دیکھنے کی دعوت پائی تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر انکار کر دیا۔

"نا بابا! بھابی پہلے ہی جلی بھُنی رہتی ہے۔ میرے یہاں آنے پر۔ آپ لوگوں کے تو گھر سے چڑ جاتی ہے۔ اب سینما چلی گئی تو پھر میری خیر نہیں ہوگی۔ آپ جائیے۔"

یہ سُن کر ایک گونہ اطمینان ضرور نصیب ہوا مجھے کہ اب میں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھوں گا۔ لیکن یہ صدمہ بھی محسوس کیا کہ اُس نے اپنی بھابھی کی خاطر ہماری دعوت ٹھکرا دی تھی۔ کبھی یہی اِبھا تھی کہ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ میری

اچھا

پسند کی چیزیں، میری کتابیں، میری باتیں، کونسی بات تھی جس پر وہ جان نہیں دیتی تھی لیکن اب جیسے اُسے کسی بات سے سروکار ہی نہیں تھا۔ وہ ہر چیز بھول گئی تھی۔ اچھا کے اندر سے ایک اور اچھا نے جنم لے لیا تھا۔

ایک دن چندر لیکھا نے میری ملاقات سچ مچ ہی ایک نئی اچھا سے کرائی ۔۔۔ بولی ۔۔۔ "گذشتہ چار سالوں میں اس نے روپیے جمع کر کے ایک مکان خریدا ہے تین کمروں والا۔ چھوٹا مگر خوبصورت مکان، جو سرکار کی سرپرستی میں نئی نئی بستیاں بسانے والی ایک کمپنی نے بہت ہی آسان قسطوں پر دیا ہے۔"

"اچھا ۔۔۔" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ اور کہا "ہم لوگوں نے تو اپنے مکان کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں۔ یہ لڑکی تو بہت ہوشیار نکلی!"

"اور نہیں تو کیا؟ آپ کو تو میں نے کتنی بار کہا لیکن آپ ہمیشہ ٹال جاتے ہیں۔"

بات واقعی ٹالنے کی ہی ہوتی تھی۔ کبھی وقت پر انشورنس کا پریمیم تو ادا نہیں کر پایا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ کتنی جگہ انشورنس کرانے کے بعد اب معاملہ بالکل ٹھپ تھا یہی غنیمت تھا کہ زندگی کا ٹھیلہ کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

کوئی ایک مہینہ اپنی بھابی کے ہاں رہنے کے بعد اچھا ہمارے ہاں آ گئی۔ وہ دو ہی مہینے کی تو سسرال سے چھٹی لے کر آئی تھی۔ اب ایک مہینہ ہمارے ہاں آ کر رہیگی یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا کہ اتنا عرصہ میرے پاس رہ کر وہ ضرور پھر سے پہلے جیسی ہو جائیگی۔ متوسط درجے کی عورتوں کی گھریلو باتیں بھول کر پھر میرے ساتھ اچھے اچھے موضوعات پر بحث کیا کریگی۔ میں اُسے سمجھاؤں گا بھولی ہوئی باتیں یاد دلاؤں گا۔ اُسے اس غلط راستے سے واپس لے آؤں گا۔ جہاں وہ بھٹک گئی تھی۔ جانے میں ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا!

شاید اس لیے کہ کسی زمانے میں وہ ذہنی طور پر میرے بہت قریب تھی۔

اُس کے آنے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ میری اُمیدوں پر پانی پھر گیا ہے وہ ناقابلِ علاج تھی۔ اس کا سدھارنا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ صبح سے شام تک اپنی بہن کے پاس بیٹھی وہی گھسی پٹی باتیں کرنے میں لگی رہتی۔ جن سے میں بیزار تھا۔

"مجھے بھابھی پر بہت اُمید تھی۔ اب ہمارا اس دُنیا میں کون ہے! چھوٹا بھائی تو ابھی پڑھائی میں لگا ہوا ہے جانے کب بڑا ہوگا۔ کب کسی کام لگے گا اپنی بہنوں کو جانے پوچھے گا بھی یا نہیں۔ دُنیا کو بدلتے دیر تھوڑی لگتی ہے۔! اسے بھی کہیں ہماری بھابی جیسی بیوی مل گئی تو بس! ہمارے لیے میکے کی ساری کشش ختم! لڑکیاں شادی ہو جانے کے بعد میکے سے اور چاہتی کیا ہیں۔ عزت نا! وہ بھی نہ ملی تو پھر کیا رہ گیا یہاں! بھابی سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ کسی دن میری خاطر کوئی اچھی ترکاری یا خاص میٹھی چیز ہی تیار کرائی ہوتی۔ عزت آبرو یہی ہوتی ہے سر پر کوئی تاج تھوڑا ہی دھرا دیتا ہے بہن! لیکن بہن کہیں اُس سے کہہ نہ بیٹھنا۔ یہ شکایت صرف تمہارے سامنے کر رہی ہوں۔ اُسے کہنا ہوتا تو منھ پر نہ کہہ دیتی!"

چندر لیکھا جیسا تیسا کر کے اس کے لیے اچھا کھانا تیار کر دیتی۔ ابھا کے نہ نہ کرنے کے باوجود اُسے صبح و شام ناشتہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ بازار سے منگوا کر کھلاتی —— مجھ سے کہتی —— "کیا کیا جائے۔ چھوٹی بہن ہے۔ اس کی باتوں سے دل بھر آتا ہے برسوں بعد پردیس سے آئی ہے۔ بھائی بھابی نے اس کی قدر نہیں کی۔ انکی مرضی! ہم تو اپنا فرض پورا کریں!"

میری طرف سے اُسے کھلی چھٹی تھی۔ اگر اُس کی بہن تھی تو میری بھی تھی۔

میں اپنے فرض سے غافل نہیں تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ میں اُس کی طرف سے بالکل مایوس ہوچکا تھا کہ کبھی میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے پوچھے گی — "جیجا جی! یہ ہر وقت کیا پڑھتے رہتے ہو! تمہیں کتابوں سے اتنا عشق کیوں ہے؟"

ایک مہینہ گذر گیا۔ ابھا کے سُسرال سے ہر روز خطوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا تھا۔ اِسے لینے کے لیے وہاں سے کوئی نہ کوئی شخص جلدی ہی پہنچنے والا تھا۔

اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اِبھا کو کیا دے کر رخصت کیا جائے چندر لیکھا کی چھوٹی بہن تھی۔ کچھ لاڈلی بھی تھی۔ منہ سے مانگتے ہوئے بھی نہیں جھجکتی تھی پھر یہ بھی خیال تھا کہ اِس کی بھابھی نے اس کی کوئی قدر نہیں کی تھی۔ وہ کہیں دل شکستہ ہوکر یہاں سے نہ لوٹے۔ جس دن میں تنخواہ لے کر آیا۔ چندر لیکھا نے مجھے بتایا۔

اِبھا زبیر کے لیے تین پہیے کا سائیکل مانگتی ہے۔ میرے ساتھ ایک دن بازار گئی تھی جارجٹ کی سفید ریشم سے کاڑھی ہوئی ایک ساڑھی اور بلاوز پسند کر آئی تھی کاسنی شنیل کی قمیص اور شلوار لینے کا بھی اس کا خیال ہے آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟"

میں نے سُنا تو دل کو جیسے برف کی سِل کے نیچے دبتا ہوا محسوس کیا لیکن بڑے ضبط سے پوچھا — "بس یا اور کچھ!"

چندر لیکھا کے چہرے پر خوشی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ بولی — "اتنا کم ہے! ڈیڑھ سو کے تو یہی ہوجائیں گے! کچھ بچوں کے کپڑے بھی ہوں گے"

"وہ کیا کیا ہونگے — بتادو" میں نے اِس طرح کہا جیسے اُسے ہر چیز دلانے کے لیے تیار تھا۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے لیکن خوشامد بھرے لہجہ میں کہا —

"آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟"

"کہونا — میں کبھی ناراض ہوسکتا ہوں —" میں ہنس بھی پڑا۔ کچھ وہ بھی ہنسی۔ بولی — "دراصل بات یہ ہے! آج ابھا میرے ساتھ بازار گئی تھی۔ نیا کلاس ہاؤس سے ہم کپڑے توسب لے آئے ہیں۔"

"اُدھار؟"

"ہاں اُدھار ہی تو — امیرے پاس روپے تھوڑے ہی رکھے تھے!" اس نے ایک مغموم سی شوخی کے ساتھ کہا۔

"پھر — کتنے کا بل بنا ہے؟"

"ایک سو بنتیس روپے بارہ آنے!"

"اچھا — !" میں نے تھوک نگل کر حلق تر کیا لیکن اُسے معلوم نہ ہونے دیا اور — پرچھا — سائیکل — !"

"سائیکل لینا ابھی باقی ہے وہ آپ ہی لا سکتے ہیں ہم عورتوں کا کام تھوڑی ہے۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔ وہ میں ہی لے آؤنگا۔" یہ کہکر میں نے کوٹ کے اندر والی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا — "یہ اس مہینے کی تنخواہ ہے۔ ایک سو بنتیس روپے۔ سوسائٹی کے قرضے کی اور دیوالی کے اڈوانس کی قسطیں بھی کٹ گئی ہیں۔ جلدی سے مجھے سائیکل کے لیے روپے نکال کر دیدو تاکہ ابھی جاکر لے آؤں۔"

"کل ایک سو بنتیس!" حیرت سے اس کا منھ کھلا رہ گیا۔

"اور نہیں تو کیا — !کہا نہیں تھا اس مہینے سے سب کچھ کٹے گا۔"

"مجھے تو بالکل یاد نہیں رہا تھا۔ لیکن ـــ لیکن یہ سب دے دیں تو مہینہ بھر کھائیں گے کیا ـــ؟ مکان کا کرایہ، بچّوں کی فیسیں ـــ!"

"وہ تم جانو ـــ" میں کمرے کے اندر چلا گیا۔ ابھا اپنا ٹرنک کھولے ساتھ لے جانے والی ساری چیزیں سنبھال سنبھال کر رکھنے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی ـــ "جیجا جی ـــ کل وہ آرہے ہیں مجھے لینے، آج خط آیا ہے۔"

"اچھا ـــ کیا جگدیش خود آرہا ہے!"

"ہاں ـــ میں نے لکھا تھا خود ہی آجائیں تو اچھا ہے۔ سوچا سردیوں کا موسم ہے لمبا سفر اور ساتھ بچے ہیں بہت پریشان کریں گے راستے میں۔ اور پھر وہ خود بھی تو یہاں کئی سالوں سے نہیں آپائے تھے۔ آکر سب سے مل بھی جائیں گے۔"

"بہت خوشی ہوئی یہ سُن کر!" میں اور کیا کہتا۔ چندر لیکھا کو یہ بتانا تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ جگدیش کو بھی آخر کچھ نہ کچھ دینا ہوگا۔ اس کا بھی ہم پر کچھ حق تھا۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ ابھا کو بھابھی نے ہم سب سے کسی طرح بھی کم نہیں دیا تھا دونوں بچوں کے لیے ایک ایک طلائی انگوٹھی دی تھی۔ نو نو نیکریں اور بش شرٹیں۔ بوٹ جرابیں۔ کھلونے اور ابھا کے لیے جانے کتنے کپڑے تھے۔ جتنے تھے ہم سے تو زیادہ تھے۔ ابھا تو خواہ مخواہ بھابی کی تنگ دلی کی شکایت کرتی رہتی تھی۔ وہ تو بڑی دریا دل نکلی۔ پھر سوچا ممکن ہے اس کے بھابھی اور بھائی کے آپس کے جھگڑے کا یہ نتیجہ ہو۔ بہرحال وہ یہاں سے فخر اور غرور سے سر اونچا کر کے سسرال لوٹ سکے گی ابھا یہی فخر و غرور رہی تو اس کا سرمایہ تھا۔

ابھا جگدیش کے ساتھ ہنسی خوشی رُخصت ہو گئی۔ میرا مطلب ہے، خیریت سے گئی

اگرچہ جاتے وقت اس کی آنکھوں سے اشکوں کی ندیاں رواں تھیں جو اس کی بہن بھابی اور دوسرے گھر والوں کو بھی آبدیدہ بنا رہی تھیں۔ بہت ہی رقت انگیز منظر تھا۔

دوسرے دن دفتر سے لوٹا تو معمول سے کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا۔ سوچا آج چائے کے دو پیالے پیوں گا۔ روزانہ ایک پیتا تھا۔ لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی کسی جھگڑے کی آواز سنائی دی۔ چندر لیکھا کی بھابھی کی آواز معلوم ہو رہی تھی، وہ کافی عرصہ کے بعد ہمارے ہاں آئی تھی۔ میں نے بتایا ناکہ اس واقعہ کے بعد جہاں میں اُن کے ہاں نہیں جاتا تھا وہ لوگ بھی کم ہی آتے جاتے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

" میں جھوٹ نہیں بولتی — بھگوان گواہ ہے۔ ابھا نے مجھ سے بھگوان کی قسم سے کر یہ بتایا تھا کہ تم لوگ ہر وقت میری برائی کرتے رہتے ہو۔ اُس نے مجھے تمہاری بیسیوں باتیں بتائیں، میں رہ نہ سکی اس لیے چلی آئی — ورنہ قسم کیوں توڑتی — لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم لوگ بڑے — "

مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔ میں بھی سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرے پیچھے پیچھے چندر لیکھا اندر آئی۔ جلدی سے بولی — " غضب ہو گیا — ابھا نے تو — "

میں نے اس کا منہ بند کر دیا۔ " خبردار اس کے بارے میں ایک بھی لفظ منہ سے نہ نکالنا۔ وہ تو بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ بہت ہی سمجھدار اور ایک کامیاب عورت!"

سنگٹ

۱۹۵۸ء

ریفیوجی بستی میں جانن مل کے کوارٹر کے سامنے زمین کا ایک پلاٹ عرصہ سے خالی پڑا تھا۔ محکمہ بحالیات نے ابھی تک وہاں کوئی کوارٹر تعمیر نہیں کیا تھا۔ بہت سے لوگ پاکستان میں اپنی چھوڑی ہوئی جائداد کے منظور شدہ معاوضے میں اِس جگہ کو حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن محکمہ بحالیات وہاں بچوں کا پارک بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ صرف فیصلہ ہی۔ صحیح معنوں میں پارک بنانے کا کام تو خود ان لوگوں کی ایک کمیٹی کو کرنا تھا جو اپنی خود غرضیوں کی بنا پر اپنے ہی لوگوں کا اعتماد کھو چکی تھی اور دس سال گزر جانے پر بھی پارک نہیں بن سکا تھا۔

ایک دن جانن مل نے زمین کے اِس خالی ٹکڑے پر کھڑے ہو کر بہت بے چینی اور بہت ہی تیزی سے ایک بات سوچی اور کسی دوسرے سے مشورہ لیے بغیر دوسرے ہی دن رات کو بہت سے بانس اور لکڑی کی بلیاں منگوا کر اس پلاٹ کے ارد گرد ایک کٹہرا بنوا ڈالا۔ گھاس پھوس کے دو چھپر بھی کھڑے کر لیے اور لوگوں نے دوسرے دن دیکھا وہاں چار بھینسیں اور چھ گائیں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ جن کے آگے ایک شخص چارہ کاٹ کاٹ کر ڈال رہا تھا اور جانن مل لکڑی کے ایک تخت پر بیٹھا دودھ بیچ رہا تھا۔

چھ فٹ اونچا اور سوکھا ہوا شریر، لمبی ٹھوڑی، پھولی ہوئی سخت بانس کی ناک، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جھریوں کے اُلجھے ہوئے جال، ہونٹوں پر جھکی جھکی مونچھیں

جنہیں ذرا قاعدے سے ترشوانے کا خیال اسے کبھی کبھی ہی آتا تھا اور کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں جو وہ بچپن سے پہنتا چلا آرہا تھا۔ شلوار، قمیص اور بغیر کلاہ کی پگڑی جس کا نیچے کا سرا ہمیشہ اس کے آگے پڑا رہتا اور دوسرا اوپر کا سرا کبھی دکھائی نہ دیتا۔ جانن مل ریلوے ورکشاپ سے ہیڈ کلرک کے عہدے سے پینتیس سال کی ملازمت کے بعد ریٹائر ہوا تھا۔ اسے ریلوے نے پروویڈنٹ فنڈ اور دیگر مراعات ملا کر آٹھ ہزار روپے دیے تھے۔

روپے ملتے ہی اس نے پہلے اپنی بڑی لڑکی شیاما کا بیاہ کر دیا تھا۔ شیلا، بملا اور سروج ابھی کنواری تھیں۔ جگدیش اس کا ایک ہی لڑکا تھا، وہ بی۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ جانن مل نے سوچا تھا اب وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کب تک بیٹھا رہ سکتا تھا۔ اس طرح تو وہ سب روپیہ آہستہ آہستہ خرچ کر بیٹھے گا اور لڑکیاں جو شادی کی عمر کو گلوہ کی بیل کی طرح بڑھ رہی تھیں۔ ایک دن اچانک اس کے ہاتھ پاؤں پھُلا دیں گی۔ بیوی کی اس تجویز کو بھی اُس نے رد کر دیا تھا کہ وہ لکھنؤ چھوڑ کر حصار چلا جائے۔ جہاں اس کے ایک دو رشتہ دار رہتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد دس سال تو یہاں ملازمت میں گذر گئے تھے، اور یہیں رہتے سہتے دو چار بھائیوں کے ساتھ اچھی جان پہچان بھی ہو گئی تھی جو دُکھ سُکھ کے موقع پر آ پہنچتے تھے۔ اس کے لیے تو اب پنجاب بھی نئی جگہ تھی اور دہلی بھی۔ جہاں جا تا نئے سنگی ساتھی بناتے بناتے بھی دو سال گذر جاتے۔ اس نے لکھنؤ ہی میں بس جانا ٹھیک سمجھا۔ یہاں پانچسو کوارٹروں میں پانچ ہزار سے زیادہ لوگ رہتے تھے جن کے رسم و رواج، طور طریقے اور زبان وہی تھی جو جانن مل کی تھی۔ وہ لوگ بھلے ہی ایک دوسرے کی ترقی، خوش حالی یا خوشی کو حسد بھری نگاہ سے دیکھتے ہوں

پھر بھی اِن کے روزمرّہ کے برتاؤ میں ایک اپنا پن بھی جھلکتا تھا۔

جس کوارٹر میں جانن مل رہتا تھا وہ پہلے کسی دوسرے شخص کے نام الاٹ ہو چکا تھا اور اسے حکومت کی طرف سے اپنی کھوئی ہوئی جائداد کے عوض ملا تھا۔ بیوی کی مسلسل بیماری اور روپے پیسے کی سخت تنگی سے پریشان ہو کر اس شخص نے اپنا کوارٹر جانن مل کے ہاتھ بیچ دیا۔ جانن مل نے اسے اصل قیمت سے بارہ سو روپے زیادہ دے کر کوارٹر اپنے نام منتقل کرا لیا۔ سودا مہنگا نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے اس سودے کی تعریف کی بہت سوں نے منھ بنایا صرف اس لیے کہ جانن مل ایک عرصہ سے کرایہ دیتے رہنے کے بعد ایک مکان کا خود مالک بن گیا تھا۔ کسی سے قرض لے کر نہیں۔ اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی سے۔ اٹھاون برس کی عمر میں پہلی بار مالک مکان کہلانے کا حق اور فخر حاصل کر سکا تھا۔ ان ہی لوگوں نے اسے خالی پلاٹ پر ناجائز طور پر قبضہ کر کے دودھ کا دھندا کرتے دیکھ کر پھر منھ بنایا۔ ایک دوسرے سے شکایت کی اور جانن مل نے جو اس بات کے لیے پہلے سے تیار تھا ان میں چند مہاپرشوں کے گھر دو دن تک صبح و شام مفت دودھ بھجوا دیا جن میں سے ایک آریہ سماج کے پردھان تھے ایک سنگھ سبھا کے معزول شدہ جنرل سکریٹری تھے اور دو آدمی ایسے تھے جن کا حقیقی پیشہ کھدر پہننا، منسٹروں سے لے کر ان کے چپراسیوں تک سے ساتھ تعلقات رکھنا اور پولیس کو ہر وہ خبر مہیا کرنا تھا جس سے ایک طرف پولیس کی خوشنودی حاصل ہو سکے اور دوسری طرف سے کچھ روپے چائے پانی کے لیے بھی مل جائیں۔ در اصل ان ہی لوگوں کی وہ کمیٹی تھی جو اس علاقے کے لیے سرکار کی زیر سرپرستی بنائی گئی تھی جو آج تک وہاں بچوں کے کھیلنے کے لیے پارک نہیں بنا پائی تھی۔ انھیں جانن مل نے دونوں ہاتھ باندھ کر بتایا۔

"میں ہمیشہ یہاں تھوڑی قبضہ جمائے رہوں گا! میں تو یہاں تب تک رہوں گا جب تک مجھے بستی کے لوگوں کی خالص دودھ سے خدمت کرنے کی اجازت دی جائے گی"

جانن مل کا دودھ واقعی خالص ہوتا تھا۔ اگرچہ بہت مہنگا ہوتا! بارہ آنے سیر! بستی سے باہر سے جو گوالے آکر گھروں میں دودھ پہنچا جاتے ان کا نرخ نو آنے ہوتا تھا کچھ ہی عرصہ کے بعد جانن مل نے محسوس کیا کہ لوگ خالص دودھ کے اتنے شوقین نہیں ہیں جتنے پانی ملے یا کریم نکالے ہوئے دودھ کے۔ جو لوگ اس کے پاس آتے تھے وہ بہت کم مقدار میں دودھ خریدتے جیسے کوئی سیر بھر، کوئی آدھ سیر ہی اور کوئی کوئی تو ایک پاؤ لینے کے لیے پہنچ جاتا اور جانن مل کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی، اور وہ جل بھن کر شکایت کرتا۔

"اب ہم لوگ ویسے کہاں رہ گئے جو گھڑوں دودھ اور گھی پی جایا کرتے تھے!"

دودھ دوہے جانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا کوئی کلرک اپنا خالی لوٹا تخت پر تیزی سے گھماتے ہوئے بول اٹھتا ــــــ

"کہاں سے پئیں لالہ جی! اب اتنی آمدنی کہاں ہے؟"

بالکل بڑھیا نظر آنے والی ایک بتیس سال کی عورت بھی کہے بغیر نہ رہ سکتی۔

"واہگورو کی کرپا سے میرے گھر میں دس جیو ہیں۔ دودھ پینے کے لیے سب کا ایک دن مقرر ہے۔ سب کو ایک دن دودھ ملتا ہے باقی نو دن جا!"

"یار میرا تو لڑکا بیمار ہے" سائیکل پر کتنی دیر سے جھکا ہوا کوئی نوجوان سکھ اداس ہو کر کہنے لگتا ــــ "جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا تب تک میں خالص دودھ لیتا رہونگا اس کے بعد بند کر دونگا!"

موقعہ ملنے پر جانن مل دبی زبان سے کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیا کرتا "خالص دودھ

کے لیے پیسے نہیں ہیں ان کے پاس لیکن اپنے اور بیوی کے فیشن پر پوری تنخواہ خرچ کر ڈالیں گے!!"

لوگ اُدھار لے جانے کے بھی عادی تھے۔ زیادہ تر نوکری پیشہ تھے۔ تیس دن اُدھار کھاتے۔ تنخواہ ملنے پر ادا کر دیتے۔ بیشتر ایسے بھی تھے جو ایک مہینے کا حساب تیسرے مہینے اور تیسرے ماہ کا پانچویں میں جاکر صاف کرتے تھے۔ ایک دن جانن مل نے اُدھار لے جانے والوں کا حساب جوڑا۔ سات سو روپے کے قریب بنتے تھے، اور اچانک وہاں ایک دوکاندار کے آجانے پر اس کے سامنے اپنا رونا رویا تو اُس کان وار نے بتایا —— "اس کالونی میں یہی تو مصیبت ہے۔ اُدھار لینے والے جیسے جنگل میں شکاریوں کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔ جہاں کوئی نئی دُکان کھلی وہاں انہوں نے فوراً دھاوا بول دیا۔ نیا نیا دوکاندار گاہک بنانے کی لالچ میں ایک دو مہینے بخوشی اُدھار دیتا رہتا ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کی طرح بغل میں ہر وقت کھاتا دبائے گاہکوں کی تنخواہ ملنے کی تاریخ اور ان کے مکانوں کے پتے پوچھنا شروع کر دیتا ہے۔!"

جانن مل کو چند ہی مہینوں کے بعد معلوم ہو گیا کہ سرکاری نوکری بدرجہا بہتر تھی۔ دوکانداری میں کوئی خاص لابھ نہیں ہے۔ اس کی تو اصل رقم بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اس نے جو گائے اور بھینسوں کی تعداد بڑھانے کے لیے ایک پروگرام سوچا تھا اسے ختم کر دیا۔ بہت سا دودھ روزانہ بچ جاتا تھا۔ مجبوراً وہ گھر لے جاتا۔ لیکن وہ بچوں کو اتنا مہنگا دودھ کیونکر پلا سکتا تھا۔ جب کہ اس دھندے میں کوئی بچت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے گوالے کو ہدایت کر دی کہ وہ لوگوں کی نظر بچا کر دودھ میں پانی ملا دیا کرے اور دودھ کا نرخ بھی بارہ آنے سے گھٹا کر

نو آنے کر دیا۔ لیکن خریداروں کی تعداد خاطرخواہ نہیں بڑھی۔ کچھ بڑھے تو بغیر حساب صاف کیے ہی کھسک گئے، اور دوسرے ڈیری فارم سے دودھ لینے لگے۔

جانے کس حاسد نے سرکاری دفتر میں جاکر جانن مل کے خلاف سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ رکھنے کے جرم کی شکایت کر دی وہاں سے واقعہ کی جانچ کے لیے ایک انسپکٹر بھیجا گیا۔ جسے خوش کرنے اور معاملے کو دبائے رکھنے کے لیے جانن مل کے دو سو روپے خرچ ہو گئے۔

جانن مل اپنے ڈنگروں کی تعداد میں اضافہ نہیں کر سکا تھا اسے کچھ کمی ہی کرنی پڑ گئی تھی ڈنگر سوکھ گئے تو انہیں بیچ ڈالنے میں کچھ بچت دیکھی۔ سال چھ مہینے تک وہ انہیں بیکار چارہ کھلانے کا خرچ کیوں برداشت کرتا! جگدیش کبھی کبھی باپ کے کام میں مداخلت کرتا۔ اسے اکثر سمجھاتا کہ وہ کریم نکالنے والی مشین لگالے۔ خالص دیسی گھی بیچنے میں بہت فائدہ رہے گا۔ کیونکہ یہ بالکل دوا کی طرح بکتا ہے آج کل! لیکن جانن مل نے کبھی بیٹے کی بات پر دھیان نہ دیا۔ اس کے نزدیک جگدیش بیوقوف تھا۔ لیکن اسکی بات کا یہ اثر جانن مل پر ضرور پڑا کہ وہ دودھ کا دھندا چھوڑ کر کوئی دوسرا کام شروع کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ لکڑی کی ٹال کھولنے کا ایک خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوا جو اس کے نزدیک دودھ سے زیادہ فائدہ مند تھا۔ کیونکہ لکڑی کی ہر گھر میں ضرورت ہے۔ پڑی بھی رہ جائے تو خراب نہیں ہوتی۔

ایک دن اس نے دودھ بیچنا چھوڑ دیا اور اسی جگہ پر بہت سی لکڑی خرید کر جمع کر دی۔ ایک چھپر پڑی ہوئی لکڑی کو بارش سے بچانے کے لیے وقف کر دیا۔ دوسرا چھپر گوالے کو دیدیا جو اسی سے دو بھینسیں خرید کر وہیں دودھ بیچنے لگا تھا۔ جگہ اور چھپر

کے عوض جانن مل کو وہ روزانہ ایک سیر دودھ مفت مہیا کرنے لگا۔ جانن مل اب دن بھر ایک درخت کے مضبوط تنے کے ساتھ بندھے کانٹے کے قریب ایک چارپائی پر سر کے نیچے پگڑی اور پرانے بہی کھاتے رکھے لیٹا رہتا۔ دو پٹھان ذرا فاصلے پر تیز کلہاڑوں کے ساتھ ٹخ ٹخ لکڑی پھاڑتے رہتے۔

دودھ کے پرانے گاہکوں میں جنہوں نے ابھی تک اپنا حساب بے باق نہیں کیا تھا ایک بیوہ عورت بھی تھی۔ ستونتی! ستونتی نے کئی مہینوں تک لگاتار اسکول اور کالج میں پڑھنے والی اپنی لڑکیوں کے لیے اس سے دودھ لیا تھا لیکن ابھی تک ایک پیسہ ادا نہیں کر پائی تھی۔ اس کے نام پورے سو روپے نکلتے تھے وہ جانن مل کی ہموطن بھی تھی اور اسی کی برادری کی بھی۔ جانن مل اپنی رقم کے لیے اس پر کچھ دباؤ ڈالتا تو تعلقات بھی بگڑتے اور رقم الگ خطرے میں پڑ جاتی۔ اس کے دماغ میں ایک اور تجویز آئی۔ ستونتی جس مکان میں رہتی تھی وہاں اسے اور اس کی لڑکیوں کو بہت تکلیف رہتی تھی۔ اس محلے کے لڑکے بہت شرارتی تھے وہ کوئی دوسرا مکان چاہتی تھی۔ اس کالونی کے اندر بہت سے لوگوں نے نئے نئے کمرے بنوا کر کرائے پر دے رکھے تھے۔ چند سو روپے خرچ کر کے مکان کے برآمدے کو ایک کمرے میں تبدیل کیا جا سکتا تھا، اور وہاں ایک کمرے کا کرایہ آسانی سے پچیس سے تیس روپے تک مل جاتا تھا۔ جانن مل کے کوارٹر میں دو برآمدے تھے اس نے دونوں برآمدوں کو کمروں میں تبدیل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کمرے بن گئے۔ ایک کچھو بھی۔ پچاس تک دینے کی کئی لوگوں نے پیش کش کی۔ لیکن جانن مل نے کسی کو جگہ نہیں دی۔ وہ ستونتی اور اس کی لڑکیوں کو وہاں لے آیا۔ ستونتی سے بتیس روپے لینا اسے منظور تھا کیونکہ ستونتی اس کی ذات برادری کی تھی، اپنے شہر کی تھی۔ اس سے

پچھلے حساب کے بھی دوسو روپے لینے تھے۔ اب وہ ہر مہینے مکان کا کرایہ بھی اسی حساب میں لکھتا جائے گا۔ سنونتی کو سرکار سے اپنی جائداد کا ابھی تک معاوضہ نہیں ملا تھا۔ ملنے والا تھا۔ اسی سال سرکار بیوہ عورتوں کے معاوضے دینا چاہتی تھی سنونتی سے ساری رقم اکٹھی مل جائے گی۔ اسے اطمینان تھا۔ وہ خوش تھا۔ سال کے آخر میں آٹھ نوسو روپے ہو جائیں گے۔ اتنی اکٹھی رقم ملنے پر وہ شیلا کی شادی کردیگا ایک جگہ وہ بات پکی کر چکا تھا۔ سنونتی کی لڑکیاں بھی شادی کے قابل تھیں لیکن سنونتی کو ان کی شادی کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی انہیں پڑھانے کی۔ اس سال سنونتی کی بڑی لڑکی کملا نے ۔بی اے۔ ڈی کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس خوشی میں اس کی ماں نے ست سنگ کرایا تھا۔ ٹھاکر بانی بھی کچھ عرصہ بعد کملا کو ایک پاٹھ شالہ میں ملازمت بھی مل گئی پونے دوسو روپیہ ماہوار۔ سنونتی کا سنکٹ کٹ رہا تھا۔ اس کی مصیبتوں کے دن ختم ہوتے نظر آرہے تھے وہ خوش تھی۔ جانن مل بھی خوش ہوا یہ دیکھ کر۔ ایک روز اس کے پاس جا کر کہنے لگا۔

"بہن اب تم میرا قرضہ چکا سکتی ہو۔ اس سال کے آخر میں مجھے روپے ادا کردو تو میں شیلا کے ہاتھ پیلے کردوں اب وہ بڑی ہو گئی ہے۔ تم جانتی ہو جب لڑکی بڑی ہو جائے تو ماں باپ کو کتنی فکر ہوتی ہے!"

یہ سُن کر سنونتی نے مشین کی گھومتی ہوئی چرخی روک لی۔ ایک ٹانکے کا تاگا دانتوں سے توڑا اور سفید بالوں پر کپڑا ٹھیک کرتی ہوئی آبدیدہ ہو کر بولی۔

"بھیّا تم سمجھتے ہو میں تمہاری بپتا سے واقف نہیں ہوں؟ سب جانتی ہوں، اور تم بھی یہ جانتے ہو میری بپتا بھی کسی سے کم نہیں۔ نہ ہوتی تو تم سے قرض کیوں لیتی؟

اُنکی موت کے بعد میری دوسری بڑی مصیبت یہی قرض ہے۔ لیکن گھبراؤ مت بھیا! میں نے پرشوتم کو چٹھی لکھوا دی ہے۔ کملا سے پوچھ لینا پرسوں ہی اس نے لکھی ہے۔ تم جانتے ہو پرشوتم میرا بھائی ہے۔ یہاں کلیم کے دفتر میں اس کا کوئی آدمی واقف ہے۔ پرشوتم مجھے جلدی کلیم دلا دیگا اور میں تمہاری پائی پائی چکا دوں گی۔"

کلیم تو میں بھی تمہیں دلا سکتا ہوں بہن! میں بھی دفتر کے ایک آدمی کو جانتا ہوں۔ وہ تھوڑے سے روپے لیتا ہے اور سب ٹھیک ٹھاک کر دیتا ہے۔"

"نہیں بھیا، پرشوتم کے آئے بغیر یہ کام نہیں ہونے کا۔ میں نے سب پتہ لگا لیا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں۔ بیسیوں بار دفتر کا دروازہ کھٹکھٹا چکی ہوں اب تک۔"

"لیکن بہن ایک بار میرے ساتھ بھی دفتر چل کر دیکھ لو۔"

"تم نہیں سمجھتے ہو جانن بھیا!" وہ مشین پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھک گئی اور زور دے کر بولی — "جب تک میرے خاندان کا کوئی آدمی یہاں آکر کاغذوں پر دستخط نہیں کریگا تب تک مجھے ایک پیسہ نہیں مل سکتا۔"

جانن مل خاموش ہو گیا۔ جاتے جاتے بولا "پرشوتم کو جلدی آنے کے لیے ایک چٹھی اور لکھ دو نا بہن!"

جانن مل نے خود بھی پرشوتم کو تین خط بھیجے لیکن ایک سال گذر گیا۔ پرشوتم نہ آیا۔ ہر بار کوئی نہ کوئی معذرت ظاہر کر دی۔

جانن مل کی قسمت میں شاید یہ بھی لکھا تھا کہ اس کا لڑکا بی۔ اے میں فیل ہو جائے اسکی ہمت ٹوٹ گئی وہ جگدیش کی ملازمت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے خوابوں کا سلسلہ طویل تھا جاگتے ہوئے بھی وہ خواب دیکھتا تھا۔ ایک خواب کے ساتھ دوسرا خواب وابستہ تھا۔ جیسے ایک

الجھا ہوا جال ہو! اُمیدوں، سوچوں اور خون کے تانے بانے تھے۔ شیلا، کملا اور سرج اُسے ہر وقت فکر مند رکھتی تھیں۔ جگدیش فیل ہو جانے کے بعد بھی اِدھر اُدھر گھومتا رہتا تھا۔ باپ کے پاس ٹال پر نہیں بیٹھتا تھا اس کے دکھ سکھ کو نہیں سمجھتا تھا۔ پوچھنے پر کہتا۔۔ "نوکری تلاش کرنے جاتا ہوں کیا کروں کوئی ملے بھی تو!" جانن مل کو غصہ آ جاتا بھلا کر کہہ بیٹھتا "نوکری نالائقوں کے لیے تھوڑی ہوتی ہے! اتنا خیال تھا تو فیل کیوں ہو گیا تو؟"

یہ سُن کر جگدیش لال لال آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھتا۔ اسکے نتھنے پھڑ پھڑاتے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہوتے لیکن وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا جاتا۔

ایک دن کملا آئی اس کے پاس ٹال پر۔ اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ کر بولی۔

"چاچا جی ایک بات کہنی ہے آپ سے"

"کہو" جانن مل نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُسکے بالوں کے، اونچے جوڑے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھتری کی طرف، دوسرے ہاتھ میں وہ کالا چشمہ گھما رہی تھی۔ وہ سیدھی اسکول سے پڑھا کر چلی آ رہی تھی، کچھ جھجکتی اور مسکراتی ہوئی لیکن اس یقین کے ساتھ کہ چاچا اسے انکار نہیں کرے گا وہ کہنے لگی۔

"میں چاہتی ہوں بچوں کو پڑھانے کے لیے اپنا ایک اسکول کھولوں یہاں اس زمین کے ایک حصہ پر!"

یہ سُن کر جانن مل اُٹھ بیٹھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کہاں جاؤں گا؟"

کملا کچھ لمحوں تک کچھ نہ کہہ سکی۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر ٹال کی پھیلی ہوئی زمین کی طرف دیکھا اور پھر اداس لہجے میں بولی۔

"میرا خیال تھا یہ آدھی جگہ آپ آسانی سے دے سکیں گے۔ جس کا مناسب کرایہ بھی آپ کو ملتا رہتا۔"

"ہاں پہلے تو بڑا کرایہ تیری ماں سے مل رہا ہے نا مجھے! پر اب نہیں دھوکے میں آنے کا!"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے اُٹھا اور لکڑیاں پھاڑنے والے پٹھان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ جو انکی گفتگو سُننے کے لیے کلہاڑا چلاتے چلاتے رُک گیا تھا۔ اُسی سمے وہاں جگدیش بھی آنکلا۔ اسٹرائپ بشرٹ کے ساتھ ٹخنوں سے اونچی کارڈ مخمل کی پتلون پہنے اور جیبوں میں دونوں ہاتھ ٹھونسے ہوئے۔

"کیا بات ہے کملا؟" مسکرا کر کملا کی طرف دیکھا اُس نے۔

کملا نے اسے صرف یہی بتایا کہ اسکے باپ نے انکار کر دیا ہے اور جیسے وہ سب بات پہلے سے جانتا تھا باپ کے پاس جا کر بولا — "پتا جی، دے دیجیے نا تھوڑی سی جگہ کملا کو۔ اتنی ساری جگہ ہمارے کس کام آ رہی ہے؟"

"چل بھاگ یہاں سے!" جانن مل زندگی میں پہلی بار غرّایا۔ جگدیش اور کملا مزید ایک لفظ کہے بغیر وہاں سے کھسک گئے۔ جانن مل نے غصّے بھری آنکھوں سے سر گھما کر کملا کی طرف دیکھا۔

اسکی اپنی لڑکیاں چھ چھ سات سات جماعت سے آگے نہیں بڑھ سکی تھیں۔ اس کے خرچ پر ستونتی نے اپنی لڑکیوں کو بہت اچھی تعلیم سے آراستہ کر لیا تھا۔ یہ بات کچھ کم غصّے کی نہیں تھی۔!

اتفاق کی بات دوسرے دن سرکاری دفتر سے ٹال والی جگہ کو خالی کر دینے کے لیے جانن مل کے نام نوٹس آگیا۔ نوٹس پا کر وہ گھبرا گیا۔ وہ اپنی لکڑی کہاں اُٹھا لے جائے؟ اس جگہ پر سرکار نے بچوں کا پارک بنانے کی بجائے چند ڈبل اسٹوری کوارٹر بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے ایک منزلہ کوارٹر کے سامنے دو منزلہ کوارٹروں کا بننا بھی ایک مصیبت سے کم نہ تھا۔ اس کے مکان کی دیواریں اتنی اونچی نہیں تھیں کہ اوپر سے جھانکنے والوں کی نگاہوں سے وہ اپنے گھر کی عزت چھپا سکتا۔ وہ کالونی کے سرکردہ لوگوں کے پاس اپنی فریاد لیکر گیا کہ وہ حکومت کے متعلقہ افسروں تک اس کی درخواست کی سفارش کریں۔ لیکن کسی نے اس کی حمایت نہ کی۔ لوگوں کو اور مکانوں کی ضرورت تھی وہ تو دو منزلہ چھوڑ چھ منزلہ مکانوں کی تعمیر کا بھی سواگت کرتے۔

کوارٹروں کی تعمیر شروع ہوگئی۔ جانن مل نے لکڑی کی ٹال کے لیے کہیں اور جگہ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ پگڑی دینے کے لیے اس کے پاس روپے نہیں تھے۔ مجبور ہو کر اسے تمام لکڑی اونے پونے داموں پر بیچ دینا پڑی۔ اب پھر وہ بے روزگار تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر اس نے بہت سارو پیہ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے ضائع کر دیا تھا۔ سوچتا تھا کاش محکمہ اسے آخر دم تک ملازم رکھتا، یا اکٹھا روپیہ دینے کی بجائے اسے معقول پنشن ہی دیتا رہتا۔

وہ اپنے دروازے کے سامنے سیمنٹ کے پکے پلیٹ فارم پر چارپائی ڈالے پڑا رہتا۔ گلی میں سے گذرتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا۔ دن بھر یہ کالونی کچھ سنسان رہتی تھی۔ دوکاندار اور دفتروں میں کام کرنے والے صبح سویرے جا کر شام کو لوٹتے تھے وہ لوگ جو سرکاری ملازمتوں سے ریٹائر ہوئے تھے یا کسی کام کے قابل نہیں رہے تھے اکثر گلی میں گزرتے۔ دھیمی دھیمی محتاط چال سے تاکہ ان کا ہر قدم جو موت کی طرف بڑھ رہا تھا کچھ دیر سے پہنچے۔ ادھر ادھر عجیب نظروں سے تاکتے۔ رک رک کر گنجی یا سفید بالوں سے بھری ہوئی کنپٹیاں کھجا کھجا کر گرد و پیش کا جائزہ لیتے۔ کبھی کبھی بے اختیار ٹھنڈی سانس بھر کر بھگوان کا نام لیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ کبھی کبھی جانن مل کے ساتھ ان لوگوں کی گفتگو ہوتی تھی زیادہ تر وقت جانن مل کا خاموشی سے سوچنے اور یہ دیکھنے میں گذرتا تھا کہ واجد علی شاہ کے تاریخی کھنڈر کے آس پاس بسائی ہوئی اس بستی پر ریلوے شیڈ سے اڑتے ہوئے گہرے سیاہ بادلوں کے کتنے بڑے بڑے ٹکڑے آتے اور سورج کے آگے ہاتھ پھیلا کے کھڑے ہو جاتے اور بستی پر اندھیرا ٹوٹ پڑتا۔ ایک المناک اندھیرا اور جب اندھیرا دور ہو جاتا تو سیمنٹ سے لپے ہوئے ہر کوارٹر کی چھت پر کوئلے کے ننھے ننھے ذروں کی چادر بچھی ہوئی ہوتی۔ ذرے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ اڑتے ہوئے کھانے پینے کی اشیاء میں گرتے ہنستے کھیلتے بچوں کی معصوم سانسوں کے ساتھ ان کے اندر پہنچتے اور کھانسی و بخار میں جھینکتے ہوئے بچوں کو لیکر جب انکی مائیں غیر تربیت یافتہ ڈاکٹروں کی

دو کانوں کے سامنے کیو، لگا کر کھڑی ہو جاتیں تو ڈاکٹروں کے چہرے کسی اندرونی خوشی سے کھل اُٹھتے اور اُسی وقت پھر کوئی دھڑ دھڑاتا ہوا انجن سڑک پار کی چہار دیواری کے پیچھے آہنی لائنوں پر دوڑتا ہوا رُخ بدلنے والے چکر پر جا پہنچتا اور وہاں کچھ دیر رُکنا پڑ جاتا تو گہرے سیاہ دھوئیں کے کئی چھوٹے بڑے بادل کالونی کی طرف آسمان میں پھر اچھال دیتا

اتنے اداس اتنے سُست گام ماحول میں جانن مل کی نگاہیں صرف اسوقت چمک اُٹھتیں جب وہ کسی پڑھی لکھی لڑکی کو تیزی سے گزرتے ہوئے دیکھ لیتا۔ اس نیم جان بستی میں اسے صرف لڑکیوں کی شخصیت ایسی نظر آتی تھی جو ماحول کو کسی نہ کسی وجہ سے متحرک رکھے ہوئے تھیں۔ ان میں سے بیشتر لڑکیاں جو کل تک گلیوں میں بچپن کے معصوم کھیل کھیلتی پھرتی تھیں اب پڑھ لکھ کر کسی پاٹھ شالہ یا دفتروں میں ملازم ہو گئی تھیں اور اپنے اپنے گھر کیلئے مددگار ثابت ہو رہی تھیں

ایک دن گھر میں ایک ہنگامہ پیدا ہو گیا ستونتی نے چلا چلا کر محلے والوں کو جمع کر کے جگدیش پر کملا کو چھیڑنے کا الزام لگا دیا۔ یہ سُن کر لوگوں نے حیرت سے دانتوں تلے انگلی داب لی۔ ایک ہی برادری کے اندر ایسی غلیظ حرکت کسی نے پہلے کب کی تھی! جانن مل نے اس موقع پر بہت ضبط اور دانشمندی کا ثبوت دیا۔ اس نے خود بھی ستونتی سے معافی مانگی اور جگدیش کو بھی ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ستونتی کسی وجہ سے ناراض ہو کر چلی جائے اور اس کے قرضے کی رقم بھی ڈوب جائے جسے اب وہ ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا کیونکہ اب یہی رقم اس کا آخری سہارا تھی۔

اس واقعہ کے تیسرے ہی دن پرشوتم آ پہنچا۔ اسے ستونتی نے تار دیکر بلایا تھا۔ جانن مل نے اپنے بیٹے کی حرکت کی اس سے بھی معافی مانگی اور ستونتی کو کلیم کا روپیہ دلوانے کی پھر پیشکش کی۔ بہن بھائی آپس میں کچھ صلاح مشورہ کرتے رہے اور ایک دن چپکے سے ریفوجی آفس میں پہنچ کر ستونتی نے لکھ کر دیدیا کہ اسے معاوضہ نقد روپے کی بجائے زمین یا کسی

مکان کی صورت میں دیا جائے۔ جانن مل کو یہ معلوم ہوا تو وہ غصے سے پاگل ہو اٹھا۔ رفیوجی دفتر ہی میں اس نے ستونتی کے خلاف کتنی باتیں کہہ ڈالیں۔ ستونتی نے اسے دھوکہ دیا تھا۔ مسلسل دو سال تک دھوکہ دیا تھا۔ وہ بغل میں گٹھڑی دبائے جلدی جلدی گھر کی طرف چلا۔ طے کیا گھر پہنچتے ہی ستونتی کو گھر سے باہر نکال دے گا۔ اس کا سامان اپنے ہاتھوں سے باہر پھینک دے گا۔

ستونتی گھر میں نہیں تھی جانے کہاں تھی۔ گھر میں کوئی نہیں تھا لیکن کمرے کھلے تھے وہ کچھ حیران ہو کر ایک کمرے کے قریب گیا۔ دروازے کے پاس پہنچتے ہی اس کے کانوں میں کسی کے ہلکے ہلکے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک گیا۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر دبے پاؤں دروازے کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا جسکی اوٹ میں سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"تمہیں کتنی بار کہا ہے مجھے گھر پر نہ ملا کرو۔ بدنامی ہوتی ہے۔"

"تم پگلی ہو بالکل پگلی! اگر دن پر ایک جھٹکا زور کا دو نگا تو عقل ٹھکانے لگ جائیگی کیا تم بھول گئی ہو کہ ہماری محبت بدنامی جیسی چیز سے بہت اونچی ہے اور اب ہمیں بدنامی کے خوف سے بچنے کے لیے فوراً شادی کر لینی چاہیے"

"تم بیکار کی ضد کرتے ہو! میں تمہیں کہہ چکی ہوں یہ نہیں ہوگا۔ ہم ایک ہی ذات برادری کے ہیں۔ لوگ ہمیں جینے بھی نہیں دیں گے۔"

"میں لوگوں کا مقابلہ کرنا جانتا ہوں اگر تم میرا ساتھ دو تو! لیکن پہلے تم اپنے دماغ سے یہ بات بالکل نکال دو کہ ہم دونوں کپور ہونے کی وجہ سے میاں بیوی نہیں ہو سکتے۔ یہ بالکل غیر قدرتی دلیل ہے اس کے مقابلے میں ہماری محبت بالکل قدرتی ہے۔ فطرت کے عین مطابق ہے۔ ہماری خواہشات اور ضروریات کے سب تقاضے پورے کرتی ہے اور آج ہی تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم دونوں شادی کر رہے ہیں —— بڑھاؤ ہاتھ۔!"

کچھ لمحے خاموشی رہی۔ جانن مل غصے سے دانت پیستا رہا۔ وہ جگدیش کا گلا گھونٹ دیگا! پھر آواز آئی

"بولو خاموش کیوں ہو؟ یا تو میرا ہاتھ جھٹک دو!"

"لیکن"

"لیکن کیا"؟

"تم جانتے ہو ہم پر تمہارا بہت سا قرض ہے۔ وہ جب تک ادا نہیں ہو جاتا۔"

"بیوقوف مت بنو۔ یہ سمجھ لو کہ کچھ قرضے ایسے ہوتے ہیں جو محبت کر کے ادا کیے جا سکتے ہیں۔ جلدی سے ہاں کہہ دو بس تاکہ میں پھر اپنے باپ کے ساتھ ایک مورچہ لوں"!

"لیکن ایک شرط بھی ہے"

"وہ بھی کہہ ڈالو"

"تم بی اے میں فیل ہو گئے تھے۔ وعدہ کرو کہ تم شادی ہوتے ہی میری تنخواہ سے پہلے اپنا داخلہ بھیجو گے"

"بالکل یہی کرونگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میری بہنوں کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی تمہیں پر ہو گی۔"

"میں اور میری ساری تنخواہ حاضر ہے اس کام کے لیے"

"یہی سوچ کر ہی تو کملا کپور کو اپنی بیوی بنا رہا ہوں!"

"چلو! میرا انکار رہے تب!"

اس کے بعد ایک مشترکہ مترنم قہقہہ سنائی دیا۔ وہ دونوں باہر آ رہے تھے شاید! جانن مل جلدی کھسک کر باہر جا پہنچا۔ وہ تیزی سے کچھ سوچنے میں مصروف تھا۔ اچانک وہ گلی میں چلتے چلتے رک گیا ایک ہاتھ پر دوسرے ہاتھ کی مٹھی مار کر بولا ——" میں اب دیکھوں گا۔ اس کام میں سنوتی کیسے کاوٹ ڈالتی ہے؟ جگدیش آخر میرا بیٹا ہے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے کوئی کام تھوڑی کرے گا!"

دشتِ دل

۱۹۵۷ء

بوندا باندی ہو رہی تھی۔ چائے خانے کی ٹین کی چھت پر گرنے والی بوندوں سے ایک مسلسل دھیما دھیما نغمہ سا پیدا ہو رہا تھا۔ یہ چائے خانہ بس اسٹاپ کے سامنے بنا ہوا تھا۔ آخری بس جا چکی تھی، گیارہ بجنے والے تھے۔ سیلون ریڈیو کا پروگرام ختم ہو جانے کے بعد بہت سے لوگ باہر چلے گئے تھے۔ اسوقت کوئی سواری نہ ملنے کی وجہ سے رکشا اور تانگے والے بھی چلے گئے تھے، ہوا اور بارش کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی عالم باغ کی پوری بستی پر ایک گہری تاریکی کا پردہ پڑ گیا تھا، شہر سے پانچ میل دور ریلوے کے دفاتر، ورکشاپوں میں کام کرنے والوں، اور بہت سے شرنارتھیوں اور دوسرے لوگوں کی اس چھوٹی سی بستی میں صرف ایک ہی چائے خانہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا مالک ایک شرنارتھی سندھی تھا، جسے لوگ "سائیں" کہہ کر پکارتے تھے۔ سائیں چائے خانہ کو ایک بجے تک کھلا رکھتا تھا۔ کانپور جانے والی سڑک پر رات دن ٹرک اور موٹریں چلتی تھیں، وہاں عموماً ڈرائیور اپنی گاڑیاں روک کر چائے پیا کرتے تھے۔ سائیں کے دو ملازم، جو صبح چھ بجے سے کام شروع کرتے تھے اسوقت دو میزوں، اور کرسیوں کو ایک طرف ہٹا کر زمین پر سوئے ہوئے تھے۔ سائیں کا تیسرا ملازم انگیٹھی میں کوئلے ڈال رہا تھا۔

وہاں اچانک ایک ٹرک رکا اس میں سے چھ آدمی اترے، چار مزدور، ایک

منشی، ایک سکھ ڈرائیور۔ سب آدمی تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اِن کے چہروں، بدن کے کپڑوں اور سر کے بالوں پر سرخ رنگ کی گرد جمع ہوئی تھی۔ جب سب بیٹھ گئے تو سائیں نے بغیر کچھ پوچھے، مزدوروں کے سامنے چار گلاس چائے، اور ایک ایک ڈبل روٹی، منشی کے سامنے صرف چائے، اور ڈرائیور کے سامنے ایک خالی گلاس، اور ایک سوڈے کی بوتل رکھ دی، یہ ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ ڈرائیور نے اپنی بھاری بھرکم اوورکوٹ کی جیب میں سے دیسی شراب کا ادھا نکالا، اور سائیں سے کہا۔

"سائیں، چھ انڈوں کا آملیٹ دی لے آنا، جلدی جلدی:" پھر منشی کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا— "یار قسم سے بڑی بھوک لگی ہے—"

یہ لوگ روزانہ کام کر کے اسی وقت یہاں آتے تھے۔ چائے پینے کے ساتھ ساتھ منشی ایک کاپی میں کچھ حساب کتاب بھی لکھتا جا رہا تھا۔ اس نے لکھتے لکھتے پنسل روک کر مزدوروں سے پوچھا— "آج تم لوگن کے دس پھیرے بھئے نا! کیوں رام کھلاون ٹھیک ہے؟—"

"ہاں آں— دس ہی بھئے—" رام کھلاون نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"دس ہی تو ہوے منشی!" سردار موچھوں پر لگی شراب کو آستین سے پونچھتے ہوئے بولا— "سالا ٹائر پنکچر میں نہ دھنس گیا ہوتا، تو آج میں دو پھیرے اور لگا لیتا۔"

منشی نے رقم جوڑ کر کہا— "تو پندرہ روپے ہوئے۔ ایک ایک کے حصے میں تین روپے بارہ آنے پڑے۔ یہ لو سنبھال لو۔"

اس نے چاروں مزدوروں کو رقم بانٹ کر دے دی، مزدوروں نے اپنے اپنے روپے بہت احتیاط سے رکھے، اور پھر انہیں لے کر باہر چلے گئے، ڈرائیور نے انہیں پکار کر کہا ۔۔۔ "اوبے رام کھلاون! اوے سُن ذرا یہاں آ ۔۔۔"

رام کھلاون بیڑی سلگاتے سلگاتے لوٹ آیا۔

"سلنے، دو آدمی اور ساتھ میں کرے، کام جلدی ہوگا۔ پھیرے زیادہ لگیں گے، مزدوری زیادہ ملے گی ۔۔ کیا کہا ہیں سنے؟"

"آپ کہن کہ دو آدمی اور کرنی - ہاں ٹھیک تو ہے بی، پر بہتدار جی، تب ہم ایں بڑا نقصان بیٹھ بے۔"

سردار نے اُسے جوتا دکھا کر کہا ۔۔۔ "پھر وہی بات! ماروں ایک سو ایک گن کر؟ تجھے سمجھایا نا کہ زیادہ آدمیوں سے زیادہ کام نکلے گا۔ زیادہ مزدوری ملے گی۔ اب تم ایک ہزار اینٹوں کو اُتارنے اور چڑھانے میں دو گھنٹے لگاتے ہو، دو آدمی بڑھا کر ایک گھنٹہ لگاؤ گے، صبح چھ بجے سے رات کے دس بجے تک چار اور پھیروں کیلئے وقت بچا سکتے ہو۔ کیا کہا ہیں سنے؟"

"آپ کہن کہ ۔۔۔ اچھا کل صبح دیکھی جائی ۔۔۔ جے رام جی کی ۔۔۔"

"ہاں، اس میں تم لوگوں کا، اور میرا سب کا فائدہ ہے میں نے یہاں، اسی ٹھیکے میں بیس بیس پھیرے ایک دن میں لگائے ہیں"۔

رام کھلاون کے جانے کے بعد منشی نے کہا ۔۔۔

"پھول سنگھ! تمہارے پانچ روپے آج کاٹ لوں؟ ۔۔۔"

"نا بھائی، پانچ کیوں کاٹتا ہے؟ دو کاٹ - آج تو صبح بھی ایک ادھا

پیا تھا۔ پانچ کل کاٹ لینا۔"

"ارے پھول سنگھ، سیٹھ جو بگڑے گا۔ اسے بھی تو حساب دینا ہے۔"

"حساب دینے میں کونسی بڑی آفت آجائے گی، کہہ دینا، پھول سنگھ کو ضرورت پڑ گئی۔ بیس روپے اڈوانس لے گیا ۔۔۔ کیا کہا میں نے؟"

"سو تو تم نے ٹھیک ہی کہا، لیکن یہ اڈوانس تو پچھلے مہینے سے چل رہا ہے آج پانچ کاٹ لوں، تو سات باقی رہ جائیں گے ۔۔۔"

"اب جانے بھی دے منشی، پانچ تو لے گا تو باقی کیا بچے گا! پانچ ہی تو! دو روپے تو یہ سائیں لے لے گا، کل دن میں کیا کھاؤں گا؟ کھانا پینا ہی تو میرا دھرم ہے، زندگی میں میرے لیے، اور ہے ہی کون؟ نہ ماں نہ باپ اور نہ ہی جورو! چار دن جو جینا ہے، وہ مجھے خوب کھا پی کر جی لینے دے، اچھا منشی اس طرح کر، سوڈے اور انڈوں کے پیسے تو دے دے۔ ان مزدوروں کو بھی چلئے ڈبل روٹی کھلاتا ہے۔ میری خوراک کا بھی ذمہ لے لے صرف سوڈے اور انڈوں کا ذمہ! کیا کہا میں نے؟"

منشی نے سر سے میلی کچیلی ٹوپی اُتار کر آگے میز پر رکھ لی، اور بولا۔

"سیٹھ نہیں مانتا۔ ورنہ میں یہ کرا دیتا۔ اچھا کل پھر بات کروں گا، تم میرے دوست ہو ضرور کوشش کروں گا۔ آج پانچ کاٹ لینے دو ۔۔۔"

"چھوڑ یار منشی، تو بھی مرغے کی ایک ٹانگ ہی ہے! اچھا پانچ نہ کاٹ چار کاٹ لے۔ کل ایک نیا تہمد اور قمیص کے لیے کپڑا خریدنا ہے۔"

"منشی نے چھ روپے اس کی طرف بڑھا دیے۔ اور پھر بجی ہوئی چائے

کو ایک گھونٹ میں پی کر بولا: "اب جلدی سے مجھے گھر پہنچا دو ——— بارہ بج رہے ہیں!"

بھول سنگھ نے آملیٹ کا ایک بڑا سا لقمہ منھ میں رکھتے ہوئے کہا —
"یار منشی، تو مجھے جب دوست کہہ کر پکارتا ہے، تو میرا جی پھڑک اٹھتا ہے، تیری حالت دیکھ کر شراب کی قسم مجھے تجھ پر بڑا ترس آتا ہے۔ لیکن ایک بات یہ بھی بتا دوں، تجھ پر بڑا غصہ بھی آتا ہے۔ جانتا ہے کیوں؟"

"جانتا ہوں، لیکن کیا کروں؟" منشی نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"کیا کروں؟ پھر وہی گھاڑنے والی بات! اوئے مرد ہو کر کہتا ہے، کیا کروں! دیکھ اِدھر دیکھ۔ تیری جگہ میں ہوتا نا! یعنی اگر میری بیوی ایسی ہوتی تو میں اس کی گردن یوں مروڑ کر الگ کر دیتا ———!" یہ کہتے کہتے اس نے پلیٹ میں رکھے ہوئے آملیٹ کے مروڑ کر دو حصے کر دیے۔ اور پھر ایک ٹکڑے کو منھ میں رکھ کر آہستہ آہستہ کھاتے ہوئے بولا — "عورت ہے ہی کیا چیز؟ مرد کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا ہے!"

منشی کی میلی آنکھوں میں جانے کہاں سے اتنی ساری اداسی سمٹ آئی اس کے چہرے پر بجھی ہوئی راکھ کا تاثر ابھر آیا۔ اس نے چار خانے کے اندر دیواروں پر لگے ہوئے کیلنڈروں کی طرف دیکھا۔ فلمی، مذہبی، سیاسی، بھی طرح کے کیلنڈر لگے ہوئے تھے، دیوار کا جہاں کوئی حصہ ان کیلنڈروں سے بچ گیا تھا، وہاں تازہ فلموں کے پوسٹر، اور اشتہار چسپاں تھے، بارش کا اداس نغمہ، ابھی تک جاری تھا، سائیں اور اس کا ملازم آگ کے سامنے

دم بخود دھڑے ان کی باتیں سُن رہے تھے، سڑک پر ایک موٹر سَن سے گذر گئی، اور منشی نے اوپر مین کی چھت کو تکتے ہوئے کہا ــ" میں نے چاہا تھا وہ میرے سب سے بڑی خوشی بنے میں جب بھٹے سے تھکا ماندہ رات کو گھر لوٹوں، تو وہ مجھے اپنی نرم اور راحت بخش گود میں لٹا کر میرے بدن کی ساری تکان دور کر دے ساات کے چار چھ گھنٹے جو اس کے پاس گذاروں اُس دوران میں مجھے دن بھر کی کوئی بات یاد نہ آئے۔ بس میں اس سے صرف اسی بات کی آشا کرتا ہوں وہ اس کے بدلے میں مجھ سے میرا سب کچھ لے لے۔ جو کچھ بھی میرے پاس ہے، لیکن ہائے ری بھلوا! تو نے میرا کوئی بھی ارمان پورا نہیں کیا۔ میرے سات سو روپے مٹی میں مل گئے، پھول سنگھ تمہیں یاد ہے نا، المورہ کے کتنے دشوار گذار راستوں پر پیدل سفر کر کے اسے لینے کے لیے پہونچا تھا ــ"

پھول سنگھ نے پگڑی سر سے اُتار کر گود میں رکھ لی، اور بالوں کا جوڑا کس کر باندھتے ہوئے بولا:" بہت زیادہ غم نہ کر یار منشی! عورت شے ہی ایسی ہے۔ عشق پر کمر باندھ لے تو پوری دُنیا کو ہلا دیتی ہے ــ! تو نے ساڈے پنجاب دی جٹی ہیر کا نام سنیا ہوئے نا! وہ بھی ایک عورت تھی جسدے عشق دا چرچا، آج تک سارا جہان کر رہا ہے۔ لے سُن، تجھے ہیر کا ایک بند سُناؤں ــ" یہ کہہ کر اس نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر اونچے سُر میں گانا شروع کر دیا۔ ـ

بس بس زبان نوں ٹھوک اے تھے میرے عشق نوں نند نہ قاضیا دے
خالی ڈھول تئیں ہیر اکھاں والے تیتھے عشق دی جند نہ قاضیا دے
رانجھے یار دے دیکھنے باہجہ میرا انگلے جھٹ نے بند نہ قاضیا دے
نیا لکھ تھیں رانجھنا لکھ وارث اوہدی کوئی مانند نہ قاضیا دے

گاتے گاتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ چند لمحوں تک خلا میں گھورتا رہا، پھر آنسو پونچھ کر شراب کا ایک گھونٹ پیا۔ اور منشی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا ــــ

"اور وہ بھی ایک عورت ہوتی ہے؟ جو مرد کی تمام تر محبت، اور قربانیوں کو بھول جاتی ہے بالکل آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ اس کی بے وفائی کا بھی کوئی پار نہیں ہے۔ میں نے خود آزما کے دیکھ لیا ہے، تو میرے اندر ذرا جھانک کے دیکھ، تو تجھے اتنا بڑا چاک، اتنا بڑا زخم دکھائی دے گا، کیا تو جانتا ہے، وہ عورت کون ہے؟ نہیں جانتا تو کیا تیرے فرشتے بھی اس عورت کو نہیں جان سکتے۔ وہ یہیں رہتی ہے۔ اسی شہر میں کئی مرتبہ نظر آتی ہے۔ کبھی ہوٹلوں میں مٹکتی ہوئی کبھی بڑی بڑی دکانوں پر شاپنگ کرتی ہوئی۔ لپ اسٹک، پاؤڈر، اور سرخی لگی ہوئی ہوتی ہے اس کے ہونٹوں پر کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں لیکن میری طرف دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتی ہے۔ کیونکہ میں ایک معمولی ٹرک ڈرائیور ہوں اور وہ ایک بہت بڑے ٹھیکیدار کی بیوی ہے۔ میرے ساتھ آنکھیں ملاتے ہوئے بھی اس کی بے عزتی ہوتی ہے۔ کبھی وہ بھی دن تھے منشی، وہ میرے پاس چھپ کر آتی تھی۔ گھنٹوں میرے سینے پر سر رکھ کر میرے ساتھ باتیں کرتی تھی، سچ کہتا ہوں منشی گھنٹوں! اب جب اسے اپنی طرف سے اس طرح نفرت کے ساتھ منہ پھیرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ کسی دن بیچ سڑک پر مل جائے تو اسے ٹرک کے نیچے کچلتا ہوا نکل جاؤں۔ ایک دن ضرور ایسا کر دوں گا" مجھے یقین ہو چلا ہے مجھے اس کے قتل کے جرم میں پھانسی ہو گی۔"

منشی دونوں گھٹنوں کو سینے کے ساتھ لگائے کرسی میں پھنسا ہوا سا بارش کا اداس نغمہ سننے میں مصروف تھا۔ بوندوں کا جل ترنگ کبھی تیز ہو جاتا کبھی مدھم۔ پھول سنگھ نے

گلاس میں بچی ہوئی شراب منشی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔" ارے میں نے تجھے کہا ہے ناکہ بہت زیادہ غم نہ کھایا کر۔ لے یہ شراب پی لے۔ اس کے پینے سے تیرے سارے غم دور ہو جائیں گے ۔ تو ہر روز میرے ساتھ بیٹھ کر پیا کر "

"نہیں دوست! میں شراب نہیں پی سکتا۔ میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو صرف یہی کرو مجھے وہ طریقہ بتاؤ جس سے میں اِس عورت سے چھٹکارا پا سکوں۔ سچ کہتا ہوں اسوقت گھر جانے کے لیے جی نہیں چاہتا۔ گھر میں میرے لیے کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے تو سُن۔ میں تجھے ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ تو مجھے دوست کہتا ہے نا! آج میری بات مان لے۔ میں ابھی تیرے ساتھ چلتا ہوں۔ ٹرک کو میں سڑک پر روک لوں گا۔ تو اپنے کوارٹر میں جا۔ وہاں اگر کوئی گڑبڑ دیکھے تو عورت کو چوٹی سے پکڑ کر میرے ٹرک کے سامنے لے آ۔ میں اسے کچلتا ہوا نکل جاؤں گا۔ بس! ایک یار اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے؟ کیوں سائیں! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

سائیں نے کوئی جواب نہ دیا چُپ چاپ دونوں کو گھورتا رہا۔ منشی نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ سردار اس کی خاموشی کو برداشت نہ کر کے اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ پگڑی کو بغل میں دبا کر بولا ۔" اگر تو کچھ نہیں کر سکتا تو پھر مجھے دوست نہ کہا کر۔ مجھے ایک نامرد کا دوست بننا پسند نہیں ہے۔ چل اُٹھ تجھے گھر تک چھوڑ آؤں۔ کتنے پیسے ہوئے سائیں؟"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دوسرے دن رات کو گیارہ بجے چائے خانہ کے سامنے پھول سنگھ کا ٹرک رُکا تو اس میں سے پانچ آدمی باہر آئے۔ پھول سنگھ اور چار مزدور۔ منشی نہیں تھا۔

سائیں نے پوچھا تو پھول سنگھ جیب میں سے بوتل نکالتے ہوئے بولا ۔" سالا

بیوی کو لے کر کہیں بھاگ گیا ہے۔ سمجھتا ہے کسی نئی جگہ پر جا کر بیوی سدھر جائے گی۔ گدھے کی اولاد، اتنا بھی نہیں جانتا کہ وہاں جا کر نئے یار بنائے گی۔ جس عورت کو ایک بار یہ چسکہ پڑ جائے اس کے لیے بھی کہیں کوئی کمی نہیں اور ایک غیرت مند شوہر کو چاہیے کہ اس کا بس ایک ہی علاج کرے ـــــ یوں!" یہ کہہ کر اس نے گردن مروڑنے کا طریقہ پھر دہرایا۔

چائے خانے کے ملازم نے چاروں مزدوروں کے سامنے ایک ایک ڈبل روٹی اور ایک ایک چائے رکھی اور بھول سنگھ کے سامنے سوڈا اور دو انڈوں کا آملیٹ۔

اب منشی کا کام بھول سنگھ کرنے لگا۔ کئی روز گذر گئے۔ ایک رات جب وہ مزدوروں کو ان کی مزدوری کے روپے بانٹ رہا تھا تو وہاں اچانک منشی آ گیا۔ بہت ہی صاف ستھرے کپڑے پہنے اور جھومتا ہوا سا۔ وہ نشے میں تھا۔ اسے اس کیفیت میں دیکھ کر بھول سنگھ بہت حیران ہوا پوچھا ـــ "اوے اوے تو کہاں؟ یہ کیا ٹھاٹھ ہیں!!"

منشی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی شراب کی بوتل ہاتھ میں لے کر بولا ـــ "ایک گلاس ادھر دینا سائیں! آج ہم بھی بھول سنگھ کے ساتھ بیٹھ کر پئیں گے!"

"تو اتنے روز تک کہاں تھا بھئی! آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ صرف عیش کر رہا ہوں۔ عیش! میں تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں سوچا آج اپنے دوست سے ضرور ملوں گا!"

"پر منہ سے بھی تو کچھ بول۔ نوکری کیوں چھوڑ دی؟ بیوی کو کہاں رکھا ہوا ہے۔؟"

"اسے؟ اسے تو ـــ" بھول سنگھ کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولا ـــ "اسے تو ختم کر دیا۔ ایک ایسے گہرے تاریک کنوئیں میں پھینکا ہے کہ وہاں سے کبھی نکل نہیں سکتی

تم یہی کہتے تھے نا!"

"کیا سچ؟" پھول سنگھ کے چہرے پر حیرت اور خوف کے ملے جلے آثار نمایاں ہو گئے "کسی کو معلوم تو نہیں ہوا؟ اچھا ٹھہر جا ذرا۔ باتیں کریں گے۔"

اس نے جلدی جلدی مزدوروں کو رخصت کیا اور سائیں کا بل ادا کر کے ٹرک میں جا بیٹھے ۔۔۔ پوچھا ۔۔۔ "ہاں اب مجھے پوری بات بتا ۔۔۔ تو نے اُسے کیسے ختم کیا؟"

منشی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کہا ۔۔۔ "اب مجھے وہ واقعہ یاد نہ دلاؤ بس سمجھ لو کہ وہ ختم ہو گئی۔ ایک کنوئیں کے اندر ڈوب گئی ۔۔۔ اب میں آزاد ہوں بہت خوش ہوں۔ ٹرک اسٹارٹ کر واب میں شہر جاؤں گا۔ ایک جگہ پہنچنا ہے۔"

"عجیب آدمی ہے تو! نشے میں بالکل دھت ہے کیا؟ قتل کے الزام میں کہیں پکڑا گیا تو ۔۔۔!"

"اماں کچھ نہیں ہو گا۔ کوئی میرا بال تک بیکا نہیں کرسکتا۔ پوری بات پھر کبھی سناؤں گا چلو مجھے اے بی سین روڈ کے چوراہے پر اُتار دو۔"

"تو اب نوکری بھی نہیں کرے گا؟ تجھے سیٹھ پوچھ رہا تھا۔" پھول سنگھ نے ٹرک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ کی ایسی تیسی۔ ابھی تو میں نوکری کا نام بھی نہیں لوں گا۔ گھر کا سب سامان بیچ ڈالا ہے۔ اتنا روپیہ ہو گیا ہے کہ چھ مہینے آرام سے بیٹھ کر کھا سکتا ہوں۔"

معلوم ہوتا ہے بیوی کو مار کر تو اپنے ہوش و حواس بھی گنوا بیٹھا ہے۔ ان روپوں سے ایک عورت کیوں نہیں خرید لیتا! ہاں خوب یاد آئی وہ جو روپی ہے رونی! اور اپنے بھتنے پر جو کام کرتی ہے! مجھ سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہے کہ کوئی مرد کرا دو۔ مجھے کوئی

مرد اس کے لیے جچتا نہیں ہے لیکن نہیں یار تو تو اپنا یار ہے۔ جب تجھے ایک بار اپنا یار کہہ دیا ہے تو تیرے حوالے ایسی عورت کیسے کردوں جو میرے پاس بھی کبھی کبھی آکر رہتی ہے تو کوئی اور عورت ڈھونڈھ لے۔ عورتوں کی کمی نہیں ہے دُنیا میں!"

"نہیں اب کوئی عورت نہیں رکھوں گا۔ تنہائی میں بڑا مزہ ہے۔ شکر ہے کہ جنجال سے جان چھوٹی۔"

پھول سنگھ نے اسے خوش دیکھ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ اور اسے اے پی سین کے چوراہے پر اُتار کر اپنے ڈیرے پر واپس چلا گیا۔

* * * * * * *

کوئی سال بھر بعد ایک دن رات کو گیارہ بجے کے قریب منشی اسی چائے خانے میں پھر آیا۔ وہ پھول سنگھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ وہاں پھول سنگھ کو نہ پا کر سائیں سے پوچھا۔ "کیا آجکل پھول سنگھ نہیں آتا ہے؟ کیا اینٹوں کا ٹھیکہ ختم ہو گیا ہے!"

"وہ تو برابر آتا ہے! ابھی آتا ہوگا۔ آپ اتنے دن کدھر رہا ہے منشی جی!"

"ارے میرے متعلق کیا پوچھتے ہو سائیں! زندگی گذر رہی ہے کسی طرح"

"اچھا سائیں! اور تو سب ٹھیک ہے نا!"

منشی نے آج شراب نہیں پی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے میلے تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر چلا گیا۔

آدھ گھنٹہ بعد وہ پھر لوٹ آیا۔ اب وہ رکشہ میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ رکشا کو ایک طرف بند دکان کے سامنے روک دیا۔ عورت کو اُسی میں بیٹھے رہنے دیا اور خود سیدھا چائے خانے کے اندر چلا گیا۔ پھول سنگھ شراب کی بوتل کھولے ہوئے بیٹھا

مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ منشی کو دیکھتے ہی کہہ اُٹھا ــــ "آ یار منشی! تو کہاں چلا گیا تھا؟ آ ادھر بیٹھ میرے پاس۔ آج تجھے ولایتی پلاؤں؟ کل میں نے بیس پھیرے لگائے تھے۔ آج اٹھارہ لگائے ہیں۔ دو دن میں پچاس اپنی جیب میں پہنچ گئے ہیں۔ لیکن تو اتنے دن تک کہاں چھپا رہا منشی! کیا تو لکھنؤ سے باہر کہیں چلا گیا تھا؟"

"میں کانپور چلا گیا تھا، چھ سات مہینے وہاں بڑے ٹھاٹ سے گذرے۔ پھر وہاں سے الہ آباد، بنارس اور پھر پٹنہ سے ہوتا ہوا یہاں آ گیا ہوں۔"

"کوئی دھندہ شروع کیا یا نہیں؟ پر تیں نے یہ شکل کیا بنا رکھی ہے؟ یہ کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں؟ پھر یار منشی تو وہی منشی کا منشی ہی رہا!!"

"بھئی پھول سنگھ کچھ نہ پوچھو۔ روپیہ پیسہ ختم ہو گیا ہے لیکن ہاں ایک پرائیوٹ بات سنو۔ کان اِدھر کرو۔ ایک تکا ہے اپنے ساتھ اچانک مل گیا ہے۔ لیکن جیب میں پیسے دلیسے نہیں ہیں اسے دینے کے لیے۔ کیا تم خرچ کر سکتے ہو۔ دس پندرہ روپے کی بات ہے۔"

"ہوں ــــ ں!" پھول سنگھ نے خوش ہو کر ایک ہوں کھینچی اور پھر جلدی سے شراب کا گلاس خالی کر کے بولا "کہیں دور تو نہیں جانا پڑے گا؟"

"باہر رکشا میں ہے ــــ آؤ تمہیں ملا دوں۔"

دونوں اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ رکشا کے پاس جا کر منشی نے عورت سے کہا ــــ "یہی میرا دوست پھول سنگھ ہے۔ میں نے اس سے سب کچھ کہہ دیا ہے تم کوئی فکر نہ کرو۔"

اندھیرا ہونے کی وجہ سے پھول سنگھ کو ٹھیک طرح سے عورت دکھائی نہیں دی۔ ہاتھ سے ٹٹولا تو اس کی اور عورت دونوں کی ہنسی نکل گئی۔ پھول سنگھ خوش ہو کر بولا ــــ

"تو بڑے کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے! کئی دنوں سے جی مچل رہا تھا۔ اچھا اب اسے جلدی سے میرے ٹرک میں بٹھا دے۔"

منشی نے عورت کو رکشا سے اُتار کر ٹرک میں بٹھا دیا۔ جب بھول سنگھ نے ٹرک اسٹارٹ کیا تو منشی نے کہا — "میرے پاس رکشا والے کو دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ کچھ کھاؤں گا بھی۔ بڑی بھوک لگی ہے۔"

"اچھا لے — یہ پانچ کا نوٹ۔ یہیں چائے خانے میں میرا انتظار کرنا۔"

ٹرک چلا گیا۔ منشی رکشا والے کو رخصت کر کے چائے خانے میں آ بیٹھا۔ چھ انڈے منگوائے۔ ایک ڈبل روٹی۔ بھول سنگھ کی آدھی بچی ہوئی ولایتی بھی اس کے پاس تھی۔ لیکن اسے وہاں بیٹھے ہوئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گذرا تھا کہ بھول سنگھ لوٹ آیا وہ ٹرک میں سے نکل کر بڑی تیزی سے اندر آیا۔

"سالے، سور، کتے، میرے ساتھ دھوکا! میں تیری ہڈی پسلی توڑ ڈالوں گا۔ تیرا خون پی جاؤں گا۔ مجھے دوست کہہ کر میرے ہی ساتھ دغا کرتا ہے!"

وہ اسے مارتا رہا۔ سائیں نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی تو اس سے بولا — "بیچ میں نہ آ سائیں! نہیں تو تیرے کو بھی ایک دو ہاتھ پڑ جائیں گے۔ میں آج اس کا خون کر کے رہوں گا۔ یہ تو بیچ نچ نامرد نکلا۔ نامرد بھی اور کمینہ بھی"

"آخر بات کیا ہے؟ اسے جان سے ہی مارنا ہے تو باہر سڑک پر لے جا کر مار دینا۔ مجھے کیوں خواہ مخواہ پھنساتے ہو بیچ میں" سائیں نے کہا۔

سائیں نے منشی کو بھول سنگھ کے ہاتھوں سے چھڑا کر الگ کر لیا۔

بھول سنگھ بولا — "سالا کہتا تھا میں نے بیوی کو مار کر کنوئیں میں پھینک دیا ہے

اور اب وہ وہاں سے کبھی باہر نہیں آئے گی۔ اُلّو کی دُم! مجھے تیری بیوی کی ضرورت ہوتی تو اُسے میں نے کبھی کا ہتھیا لیا ہوتا۔ میں جسے دوست سمجھتا ہوں اس کے ساتھ مرتے دم تک دوستی نبھاتا ہوں۔ لیکن آج تو نے مجھ سے بھی پیسے بٹورنے چاہے جورو کے دلال! سائیں اسے چھوڑ دے۔ آج میں اس کا خون کر کے رہونگا۔

اور منشی کے پاس رُک کر دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر سر سے اوپر اُٹھا لیا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے تھے، اس نے زور سے منشی کی گردن پر دونوں ہاتھوں کا ایک مُکّہ رسید کیا۔ منشی کرسی کے اندر ہی دھنس گیا۔ کچھ کہہ بھی نہ سکا سمجھ بھی نہ سکا یہ اچانک کیوں ہو رہا تھا۔

"سُور! کُتّے! میرے ساتھ دھوکا! میں تیری ہڈی پسلی ایک کر دونگا! تیرا خون پی جاؤں گا! مجھے دوست کہہ کر میرے ساتھ دغا!"

اُس نے اُسے مارنے کے لیے پھر دونو ہاتھ اُٹھائے۔ سائیں نے بیچ بچاؤ کیا۔ لیکن پھول سنگھ نے اُسے پرے دھکیل دیا۔ بولا۔

"تو بیچ میں نہ آ سائیں! نہیں تو تیرے بھی دو پڑ جائیں گی۔ تو نہیں جانتا آج اس نے مجھے کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔ میری دوستی اور شرافت پر حملہ کیا ہے اس نے! اگر میں چاہتا تو اس کی عورت کو کبھی کا ہتھیا سکتا تھا۔ لیکن میں نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک دوست یہ کیسے سوچ سکتا ہے؟ لیکن اس کمبخت نے تو! کہتا تھا — میں نے عورت کو کنوئیں میں پھینک دیا ہے: خود بھی اُسی اندھیرے کنوئیں میں اُتر گیا اور مجھے بھی آج وہاں گرا رہا تھا:

یہ کہہ کر اُس نے پھر ہاتھ اُٹھائے چاہا کہ اب اُسے بالکل زمین کے ساتھ

ہلادے۔ مگر سائیں اُس کا ہاتھ روک کر بولا ـــــ کس کو مار رہے ہو سردار جی! اس کی آنکھیں تو دیکھو! کیسے تمہاری طرف گھور رہا ہے!"

پھول سنگھ نے ہاتھ نیچے کر لیے۔ اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے ہلایا پھر کچھ لمحوں تک سراسیمہ رہ کر اطمینان کا ایک سانس لیا۔ منشی کو اُٹھا کر میز پر لٹا دیا۔ آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو پونچھ کر شراب کی آدھی بوتل اُٹھائی اور میز کے کنارے پر بیٹھ کر سائیں سے بولا۔

"سائیں کسی کو جلدی سے تھانے بھیج دو۔ اطلاع کر آئے!"

تیرے مُنھ میں خاک

۱۹۵۹ء

گلی کے موڑ پر نالی کے پاس ایک اخبار پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اجیت ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا پھر جھک کر اخبار اٹھا لیا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اُسی وقت نکڑ کے مکان سے اُس کی بہن درشن نکلی۔ دیکھتے ہی اُس پر برس پڑی۔

"اے جیتا، کیا کر رہا ہے یہاں؟"

اجیت نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر اُسے گھورا۔ وہ پھر بولی۔

"یہ اخبار تیرا نہیں۔ اُن کا ہے۔ اوپر سے گرا ہے۔"

"اُن کا؟" اس ذکر سے اجیت کا خون کھول اٹھا: "تو کیسے جانتی ہے؟ کیا پھر اوپر گئی تھی؟"

"نہیں میں تو نیچے سورن کے پاس بیٹھی تھی۔"

"میں جانتا ہوں۔ چل تو گھر! ماں سے سب کہتا ہوں۔"

"چل چل کہہ دے۔ ڈرتی تھوڑی ہوں!"

دونوں ایک دوسرے کو شوخ خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔ دوسری گلی میں اُن کا گھر تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے اجیت نے سر گھما کر دیکھا۔ اُسی نکڑ کی طرف جہاں سے اخبار اُٹھایا تھا۔ اوپر جنگلے پر جھکا ہوا حکم چند مُسکرا

رہا تھا۔ سونے سے مڑھے ہوئے دونو دانتوں کے ساتھ۔

اجیت چودہ سال کا تھا۔ عمر کے لحاظ سے کافی لمبا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اسکی کرخت اونچی آواز کا درشن بہت مذاق اُڑاتی تھی۔ اُسے پھٹا ہوا ڈھول کہتی۔ بہن بھائی میں خوب مار پٹائی ہوتی۔ ایک دوسرے کو فرش پر، پلنگ پر، ہر جگہ گھسیٹتے اور نوچتے پھرتے۔ ادھیڑ ماں کبھی تو ہنستے ہنستے ڈانٹ دیتی کبھی غصہ آجاتا تو اجیت کے دو تھپڑ لگاکر گھر سے باہر ڈھکیل دیتی — "چل دفع ہو!" درشن کو بھی ایک دھکا دیتی۔ کپڑا سینے کی مشین کے پاس — "مر بیٹھ اب۔ یہ فراک کاٹ میرے سامنے، اری مردار، کچھ سیکھ لے مجھ سے۔ میں مرگئی تو کوئی عورت سے جینے بھی نہیں دیگا تجھے!"

بھائی سے دو برس بڑی، اُسی کی طرح چوڑے چوڑے، کھلے کھلے دانتوں سے ہنستی، چوٹی کو آگے پیچھے گراتی، ماں کا ایک ایک حکم پورا کرنے کے لیے بیٹھ جاتی۔ جب بیٹھ جاتی تو ماں کا ڈھیر سا کام کرڈالتی۔ قمیصوں کے کاج، بٹن، سوئی کا کام اور پھر استری گرم کرکے نئے سلے ہوئے کپڑوں کا ایک انبار پریس کردیتی اور جب تھوڑی دیر بعد اجیت گھسے ہوئے بغیر پالش کے بوٹوں سے کنکروں، پتھروں ٹھوکروں سے اُڑاتا، دھڑاک سے دروازہ کھول کر اندر آجاتا تو اُس کی آنکھیں بے اختیار اُدھر اُٹھ جاتیں، مسکراتیں، شرارت اور شوخی سے چمک چمک اُٹھتیں اور وہ سر جھٹک کر کہہ اُٹھتی۔

"آگیا پھٹا ہوا ڈھول پھر!"

یہ سُن کر خاکی نیکر اور آدھی آستین کی دھاری دار قمیص میں اور سر پہ معمولی طریقے سے ململ کی پگڑی باندھے اجیت سنگھ دونو ہاتھ سختی سے کولھوں پر جمائے، دروازے

کی چوکھٹ ہی پر رُک کر درشن کو یوں غصّے سے گھورتا جیسے اُسے کچّا ہی کھا جائے گا بس دیکھتے دیکھتے . !

اور ماں کی مانند درمیانے قد کی ، شوخ ، چلبلی ، بات بات پر ہنس پڑنے ، اِدھر اُدھر کی ہلکی سی آواز پر بھی چونک اُٹھنے ، اور معمولی سستے لیکن اچھی تراش اور سلائی کے کپڑے پہننے والی جن میں سے جسم کا ایک ایک انگ نمایاں بھکراتا اور بولتا ہوا معلوم ہوتا ، اپنے بھائی جیسے بھورے بالوں کی اُدھ کھلی چوٹی کو جس کے نیچے کے بال زردی مائل تھے اِدھر سے اُدھر پھینکتی جیبھ نکال کر اُسے چڑا دیتی اور وہ چلّا کر ماں کو آخری نوٹس دے دیتا ۔

" دیکھ ماں ، اب مجھے مت روکنا ۔ میں اس سے تنگ آگیا ہوں ۔ آج تو میں اس کا سر پھوڑ کر ہی رہوں گا ! "

اُس دن بھی اجیت نے ماں کے پاس پہنچکر درشن کا سر پھوڑ ڈالنے کی دھمکی دی ـــ اور بتایا ـــ " آج یہ پھر حکم چند کے وہاں گئی تھی "

" نہیں ماں ۔ جیتا جھوٹ بکتا ہے ۔ میں تو سورن کے پاس بیٹھی ایک پھول ٹریس کر رہی تھی "

" دکھا کہاں ہے ٹریس کیا ہوا پھول ؟ "

درشن ہنس کر واپس جاتی ہوئی بولی ـــ " وہیں چھوٹ گیا ہے ۔ ابھی لے آتی ہوں لپک کر ـــ "

اِس سے پہلے کہ وہ ہرنی کی طرح چھپاک سے دروازے کے باہر ہو جاتی اجیت نے اُسے پکڑ کر ماں کے پاس گرا دیا ۔ دونو پھر گتھم گتھا ہو گئے ۔ اجیت کے

کاندھے سے لٹکتا ہوا تھیلا نیچے گر گیا۔ وہ چلّائی۔

"چھوڑ پاپی ——" اجیت اسکی چوٹی پکڑ کر بار بار جھٹکے دے رہا تھا۔ اور پوچھ رہا تھا

"پھر جائے گی وہاں ؟"

"ماں ! —— میری چوٹی ! ہائے !"

"اے اے جینا ! کتّا ! ہٹ ! ہٹ !!"

"ماں تو اِسے نہیں روکے گی تو میں گھر چھوڑ کر کہیں چل دوں گا ! مجھ سے یہ سب نہیں دیکھا جاتا !"

"اچھا اچھا ! الگ بھی بیٹھ اب !" اُس کی ماں نے صرف ایک لمحہ کے لیے مشین روکی تھی۔ ہتھی کو پھر سے گھماتی ہوئی درشتی سے بولی ——

"اِس کے آگے کھانا ڈال دے۔ کھائے اور پھر جائے کام پر۔"

"میں آج کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ روٹھ کر بیٹھ رہا۔

ماں کو غصّہ آگیا —— بولی —"کام پر نہیں جائے گا تو پھر مجھے بیچ کر گھر کا خرچ پورا کرے گا ؟ بول !"

"پہلے اِسے روکو ماں !"

"روکوں گی، گھر کے بڑے بزرگ، روکوں گی ! بڑا بوڑھا بن کر مجھے سمجھانے بیٹھا ہے ! جیسے میں کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ بھول گیا ہے کہ بارہ سال سے رنڈاپا کاٹ رہی ہوں، کسی کی کیا مجال کہ آج تک کوئی نام بھی تو لے گیا ہو ! نا سمجھ ہوتی تو آج تم دونوں دَر دَر بھیک مانگتے ہوتے ! اِسے کھانا کھلا درشن ! کھڑی کھڑی دانت کیا نکال رہی ہے !"

درشن رسوئی میں جاکر اس کے لیے کھانا لے آئی۔ صبح کی پکی ہوئی روٹیاں تھیں۔ جن پر گھی مل کر نمک مرچیں چھڑک دی گئی تھیں۔ ایک پیاز بھی تھا اور آم کے اچار کی ایک ڈلی بھی۔ وہ چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ روٹیاں ننگے گھٹنوں پر رکھ لیں۔ اوپر سے ایک پڑوسن آگئی۔ سلائی کے کپڑے لے کر۔ اُن کی ماں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

درشن کا جی چاہا اُسے پھر چھیڑے۔ لیکن ماں کے خوف سے انگیٹھی اور کوئلے اُٹھا کر گلی میں جا بیٹھی۔ ٹک ٹک کوئلے توڑنے لگی۔

اجیت کھانا ختم کر کے نل پر گیا۔ نل کے نیچے منہ اُلٹا کر کے غٹ غٹ پانی پیا۔ پھر پانی سے منہ بھر کر کھُلے کھُلے دانتوں کے بیچ سے پانی کی تیز دھار نکال کر درشن کو اِدھر اُدھر دیکھا۔ باہر گلی میں سے اُس کے گانے کی آواز آرہی تھی۔

انگے نی مائے انگے
میرے ست بھترا منگے
میرا اک بھترا کنوارا
او چیلی کھیلن والا
او چیلی کتھے کھیلے؟

اجیت جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ یہ درشن کا مرغوب گیت تھا جو وہ گلی کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر گایا کرتی۔ ایک ہاتھ سے زمین پر گیند پھینکتی جاتی ہاتھ کی ہتھیلی کے ساتھ ٹھپ ٹھپ زمین پر گیند کو پھینکتی رہتی۔ جب تک

گیند گرفت سے نکل کر دور نہ جا پڑتا۔ ایک ہی لڑکی کھیلتی بھی رہتی۔ گاتی بھی رہتی۔ ماں! میرے سات بھائیوں کی سگائی طے ہو چکی ہے۔ ایک بھائی ابھی تک کنوارا ہے ــــ اُسے چپلی (گھوڑے سواروں کا ایک محبوب کھیل جس میں وہ ہاتھ میں نیزہ تانے دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور ایک خاص مقام پر زمین میں گڑے ہوئے لکڑی کے کھونٹے کو نشانہ بنا کر نیزے کی نوک پر اٹھائے جاتے ہیں اور جیت جاتے ہیں) کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔ لیکن وہ چپلی کہاں جا کر کھیلے؟

اجیت کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اُس کے لیے اِس گیت میں کوئی کشش نہیں تھی وہ ۔۔ ورشن کے دل میں اپنے پیار کی قدر و قیمت جانتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی ذرا پروا نہیں کرتی تھی۔ گیت کے الفاظ کے معنے سمجھے بغیر وہ گائے جاتی تھی۔

او چپلی کتھے کھیلے؟
لاہور شہر کھیلے
لاہور شہر اُچا
میں مُن پکا یا سُچا
میرے من نوں لگے موتی
میں بوہے وچ کھلوتی

وہ ایک میلے کپڑے کے ساتھ اپنی سائیکل بھی صاف کرتا جا رہا تھا اور کڑھ بھی رہا تھا ــــ ہوں وہ چپلی کہاں کھیلے، تیرے سر پر کھیلے ــــ لاہور شہر کھیلے ــــ اچھا اچھا وہ لاہور ہی میں جا کر کھیلے گا لیکن تجھے ساتھ میں لے جائے گا۔ لاہور شہر اونچا تو ہے تبھی تجھے وہاں نہیں لے جائیگا۔ تو نے اُس کے لیے

خالص دیسی گھی سے میٹھی روٹیاں پکائی ہیں جس میں تو نے جا بجا بہت سے موتی بھی جڑے ہیں اور تو دروازے کے بیچ کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے ——

لیکن وہ تیری محبت اور تیرا ایثار قبول کرنے کے لیے کبھی نہیں آئے گا کیونکہ تو اُس کا کہنا نہیں مانتی اور روز کسی نہ کسی بہانے حکم چند سے ملنے چلی جاتی ہے۔

وہ اسی طرح کڑھتا ہوا اُٹھا۔ سائیکل صاف کرنے والا کپڑا ایک بغیر تختوں والی الماری میں پھینک دیا جس میں اوپر تلے بہت سے پرانے اخبار بھی قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں اس کی کتابیں بھی پڑی تھیں۔

اُس کی ماں ابھی تک پڑوسن کے ساتھ گہری گہری باتیں کرنے میں معروف تھی۔ اُس کے کانوں تک درشن کی آواز نہیں پہونچ رہی تھی۔ اُسکا دھیان انگیٹھی کی طرف بھی نہیں جاتا تھا جسے سلگائے بغیر ہی درشن لڑکیوں کی ٹولی میں جاگھسی تھی۔

وہ زور زور سے پیر پٹختا ہوا دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ بہت ساری لڑکیاں زمین پر سر جوڑ کر بیٹھی ربڑ کے گیند سے کھیل رہی تھیں۔ درشن نے سر گھما کر اُسے دیکھا اور مسکرا دی۔ وہ ہتھیلی سے گیند بھی ٹھپتی رہی اور اُسے دیکھ دیکھ کر گاتی بھی رہی —— وہ چلّایا۔

"درشو یہاں تو آ!"

وہ پیر پٹختی اور سر جھٹکتی ہوئی لڑکیوں کے جھرمٹ سے نکل کر انگیٹھی کے پاس آ بیٹھی۔

"کیا ہے بے جیتا! کیوں چلّا رہا ہے"؟

"میں پوچھتا ہوں اِن سب لڑکیوں میں کوئی تیری عُمر کی بھی ہے؟ شرم نہیں آتی تجھے اِن کے ساتھ کھیلتے ہوئے؟"

"میں کھیلنے تھوڑی گئی تھی، اُنہیں گیت یاد کرانے گئی تھی۔"

"اپنا سر سڑانے گئی تھی" اجیت نے اُسے گالی دی۔

"تیرا سر سڑانے ـــــ" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ بھائی کو گالی دیتے دیتے وہ ہمیشہ رُک جاتی تھی۔ ماں کی مار کا بھی ڈر رہتا تھا۔ یوں بھی بھائی کو گالی دینا اُسے پسند نہیں تھا کیونکہ اُس کا ایک ہی بھائی تھا۔ سات آٹھ بھائی ہوتے تب بھی وہ کسی ایک کا بھی سر جلانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی تھی۔ بھائی بھلے ہی بہن کا ہر وقت جی جلاتا رہے۔ اُس نے بڑے سے کوئلے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اجیت نے اس کے ہاتھ پر اپنا بوٹ رکھ دیا۔

"چھوڑ پاپی! چھوڑ!"

"نہیں چھوڑوں گا" اُس نے پیر کو ذرا سا اور دبا دیا

"نردئی!" ورشن کی چیخ نکل گئی ـــــ "ماں!" اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ یہ دیکھ کر اجیت نے اپنا پاؤں فوراً ہٹا لیا لیکن اُسے ورشن کے رو دینے پر خوشی بھی محسوس ہوئی۔ اور اب وہ اُس کے سر پر دھول جمانے والا ہی تھا کہ اچانک بہت قریب سے گھنٹی کی ٹن ٹناہٹ سُنائی دی۔

تلوار مارکہ مونچھوں والا حکم چند اپنی نئی سائیکل پر جس کے ہینڈل پر دو دو

آ پہنچے لگے ہوئے تھے، سفید سلک کی قمیص اور دھاری دار پاجامہ پہنے اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے، پان چباتا، مسکراتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ اس کی معنی خیز مسکراہٹ اور کپڑوں، بالوں، مونچھوں اور نئی سائیکل کی نمائش اجیت کے سینے میں نیزے کی طرح گڑ کر رہ گئی۔ درشن ہاتھ کی چوٹ بھول کر سر پر جلدی جلدی دوپٹہ کھینچ رہی تھی۔ اجیت نے جب زور سے چلا کر ماں سے اُس کے انگیٹھی نہ سلگانے اور چھوٹی چھوٹی لڑکیوں میں جاکر کھیلنے کی شکایت کی تو درشن کو اپنے ہاتھ کا درد یاد آگیا۔ رو کر ماں کے سامنے اپنا ہاتھ کر دیا۔

"ماں جیتے نے اپنے بوٹ سے ـــــ دیکھو!"

ماں اور پڑوسن کی بات بیچ میں رہ گئی۔ پڑوسن اُٹھ کر جانے لگی۔ وہ ایک خاص موضوع پر اتنی دیر سے باتیں کر رہی تھیں۔ جاتے جاتے پڑوسن نے اُن کی ماں سے کہا ـــــ "مجھے اگر کل تک جواب دے سکو تو بات پکی نہ کرا دوں!"

اُن کی ماں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ چوما اور کہا ـــــ "ست بچن! میری طرف سے تمہیں پورا اختیار ہے۔ لیکن وہی بات نہ ہو جو پہلے ـــــ"

"ناں ناں بھگوان کا نام لے۔ ایک دن اُسے بھی منہ دکھانا ہے۔ اچھا تو میں چلی!"

یہ کہہ کر وہ پہلے ہوئے کپڑے ایک بغل سے نکال کر دوسری بغل میں دابتی ٹوٹی ہوئی چپلوں میں پاؤں گھسٹتی یہ جا وہ جا ـــــ نظروں سے غائب ہو گئی۔

اور ماں نے ان سے غصّہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ تم لوگ آسمان سر پر کیوں اٹھا لیتے ہو؟ ایک منٹ کو بھی تو کسی کے ساتھ چین سے بات نہیں کرنے دیتے!"

اجیت نے کچھ کہنا چاہا لیکن اُسے سائیکل کی طرف ڈھکیل دیا ــــ تو جاتا کیوں نہیں بازار ــــ دیکھتا نہیں شام ہوگئی ہے!!

پھر درشن کو بھی ڈانٹا جو اپنا زخمی ہاتھ دکھا کر کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"جلدی کر جلدی! ابھی تک انگیٹھی میں کوئلے توڑ کر بھی نہیں بھرے!"

اجیت نے سائیکل کے کیریر پر رسّیوں اور لوہے کی پتیوں کے ساتھ بندھی ہوئی لکڑی کی پیٹی میں مٹّی کے تیل کا ایک کنستر، ایک خالی بوتل اور ٹین کا ایک کپ رکھا۔ وہ بہت بے دلی سے گھر سے باہر نکلا، ماں سلائی کے کام میں مصروف تھی۔ درشن انگیٹھی میں پائپ سے پھنکاریں مار رہی تھی۔ اُسے بہن سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اب اُس کے ساتھ کبھی بات نہیں کرے گا۔ درشن نے اُسے چھیڑنے کے لیے ایک ننھا سا کُلہ ناک کر اُس کے میلے ٹخنے پر دے مارا تو اُس نے وہیں کھڑے کھڑے کہہ بھی دیا۔

"آج سے تیری میری بول چال بند۔ جو بولے اُس کے منہ میں خاک!"

خاک کھانے کی قسم دونوں کے لیے بہت بڑی تھی۔ اس قسم کی وجہ سے وہ کئی کئی دن تک خاموش رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تک نہیں تھے۔ ماں کے حکم کے مطابق گھر کا یا ایک دوسرے کا کام چپ چاپ کر دیا کرتے لیکن ایک دوسرے کے ساتھ بولتے نہیں تھے۔ کبھی کبھی تو

اُن کی ماں کو بھی گھر کے اندر یہ مصنوعی خاموشی ناگوار گزرتی اور ایک ہی ڈانٹ پلا کر ان کی قسم تڑا دیتی تھی لیکن عموماً وہ خود ہی ایسی خاموشی سے اُکتا کر پہلے تو اپنی اپنی مسکراہٹ روکے روکے پھرتے پھر کسی نہ کسی بہانے سے پھٹ پڑتے ایک ساتھ چلّا اُٹھتے — "پہلے تو نے زبان کھولی — تیرے منہ میں خاک !"

ایسی قسم پھر کھا کر اجیت ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ پیچھے سے اُسے ماں نے پکارا۔ وہ لوٹ آیا۔ بڑی بے دلی سے بولا —

"کیا ہے ماں !"

"یہ ردّی بھی لے جا۔ دس پندرہ سیر تو ہو گئی ہوگی۔"

"اگلے مہینے بیچیں گے ماں۔ ایک من ہو جانے دو !"

"ایک من ! ایک من ہوتے ہوتے تو سال سارا گذر جائے گا۔ تُو ایک ایک کاغذ چن چن کر جمع کرتا ہے۔ اسی کے جو دو چار پانچ مل جائیں تو غنیمت ہوگا۔ کپڑے والے کا بہت سا اُدھار سر پر ہے !"

اجیت کو غصہ آگیا — "تو اُس ردّی سے کیا کپڑے والے کا اُدھار اُتارنے چلی ہو !"

اُس کی ماں کچھ سوچ کر بولی — "یہاں آ تو، ایک بات کہوں۔"

"جلدی سے کہہ ڈالو۔ مجھے بہت دیر ہو رہی ہے !"

اجیت پیر پٹختا ہوا اندر آگیا — ماں اُسے برآمدے تک لے گئی — ڈاٹ کے نیچے کھڑے ہو کر بولی — "تجھے معلوم ہے۔ ہردیال سنگھ کی ماں نے

انکار کر دیا ہے۔ وہ ریڈیو، گھڑی، سائیکل اور گرم سوٹ سے کم بات ہی نہیں کرنا چاہتے۔ ہم غریبوں کے پاس چند معمولی کپڑوں کے سوا اور ہے کیا۔ وہ بھی اُدھارے رکھتے ہیں۔ پڑوسن حکم چند کی بات کر رہی تھی۔ اُس کے ماں باپ نہیں ہے۔ ہے بھی ہماری طرح غریب لیکن اُس کے پاس سب کچھ موجود ہے ریڈیو، گھڑی، سائیکل۔ وہ کچھ بھی نہیں مانگتا۔ کہتا ہے بس دو شبد پڑھوا کر لڑکی میرے حوالے کر دو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ماں!" چودہ سال کے بچّے نے گرج کے ماں سے کہہ دیا۔" مجھے اُس سے سخت نفرت ہے۔ میں اُس کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا ___"

"سُن تو بَکلا! تو تو ایسے چلّانے لگتا ہے جیسے اُس نے ہمارے خاندان میں کسی کا خون کر رکھا ہے۔ آخر بات کیا ہے؟"

"بس اُس کے بارے میں مجھ سے کچھ مت کہو۔"

وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ درشن گھٹنوں میں سر دیے لال، لال دہکتے ہوئے انگاروں کو گھورے جا رہی تھی۔ اُس نے اب اپنے بھائی کو نہیں چھیڑا۔

اجیت کو اس بات کا بھی غصّہ تھا کہ ماں نے حکم چند کی تجویز پر غور ہی کیوں کیا۔ کیا اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ہر روز اس کی شکایت کیا کرتا تھا۔ ماں یہ کیوں نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اس بات پر لڑ کر جان بھی دے سکتا تھا۔ جب سے حکم چند اُسے اور اُس کی بہن کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ اُسے جان سے مار ڈالنے کی ترکیبیں سوچا کرتا تھا۔ جب دیکھتا کہ وہ اُس سے بڑا ہے اُسے مار ڈالنا آسان نہیں ہے تو وہ آرزو کرنے لگتا کہ حکم چند کسی حادثے کی نذر ہو جائے۔ کسی موٹر یا ٹرک کے نیچے

آجائے۔ اس کے جلد سازی کے اسٹال کو آگ لگ جائے۔

حکم چند کا اسٹال بھی رفیوجی پارک میں تھا۔ دو سال پہلے اُس کا حکم چند کے ساتھ ایک بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ اجیت اسکول سے لوٹ کر شام کو رفیوجی پارک کی دُکانوں پر گیسوں میں روزانہ تیل ڈالا کرتا تھا وہاں بجلی نہیں تھی۔ پچھلے تین برسوں سے وہ یہی کام کر رہا تھا۔ اس طرح اُسے مہینے میں چالیس پچاس روپے بچ جاتے تھے۔ حکم چند کا کام جلد سازی کا ہوتا تھا۔ پہلے پہل اتنا اچھا نہیں چلتا تھا تب اُس کے پاس نہ کوئی نوکر تھا نہ مشین۔ خود ہی دفتی کاٹتا خود ہی آگ جلا کر لیئی بناتا تھا۔ جلدیں باندھ کر اپنے گاہکوں کے پاس دور دور تک پیدل پہنچانے جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے اُس کے پاس ہر چیز آگئی۔ نوکر، مشینیں، روپیہ۔ اسٹال بھی ایک سے دو ہو گئے تھے۔ وہ اپنے سکول کی دو کتابیں لے کر اُس کے پاس گیا تھا۔ وہ اپنے گیسوں میں تیل بھی تو اسی سے بھروایا کرتا تھا۔ اُس نے کہا ـــــ

"اِن کتابوں پر بہت اچھی جلد باندھ دے"

حکم چند نے اُس کی کتابیں اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیں اور کہا ـــ "چل چل، دو کتابیں اُٹھا کر آگیا ہے۔ دیکھتا نہیں یہاں سارا کام پریس والوں کا ہوتا ہے ہزار ہزار جلد کا"

"ارے یار مذاق مت کر" اجیت نے کتابیں پھر اُس کے سامنے رکھ دی تھیں۔

"یار!" حکم چند نے گھور کر اُسے دیکھا اور پوچھا تھا۔

"میں تیرا یار ہوں؟ بہت خوبصورت سمجھتا ہے نا خود کو! چل بھاگ، کسی اور کو یہ نخرے دکھانا جسے تیرا یار بننے کا شوق ہو ـــــ"

ایسے ناشائستہ الفاظ سُن کر اجیت کے دِل پر گہری چوٹ لگی تھی۔ جیسے حکم چند نے اُس کے زور کا گھونسا مار دیا تھا۔ اُس نے غصّے میں آکر کہہ دیا تھا —" تو آج سے میں بھی تیرے گیس میں تیل نہیں بھروں گا۔"

"تو نہیں بھرے گا تو دوسرے کیا سب مر گئے ہیں؟"

اُس دِن سے حکم چند نے سچ مچ ایک دوسرے آدمی سے تیل بھرانا شروع کر دیا تھا۔ اور اجیت کے دِل میں اُسی دن سے حکم چند کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی اُس واقعہ کے بعد بھی کئی بار حکم چند نے اُس کی طرف اشارہ کر کے لوگوں کو بتایا تھا — "یہ لونڈا جانے خود کو کیا سمجھتا ہے۔!" وہی حکم چند اُس کی بہن کی طرف یا اُس کی طرف مُسکرا کر دیکھتا تو اُس کا خون کیونکر نہ کھولتا؟

پہلے وہ حکم چند کی دوکان کے سامنے سے بے دھڑک گذر جاتا تھا اُسے اُس کی ذرا پروا نہیں تھی۔ لیکن آج وہ اُس کی دوکان کے سامنے گذرنے کی ہمّت نہیں کر سکا۔ سائیکل کو ایک مخصوص جگہ پر تالا لگا کر بارک کی دوکانوں پر گیسوں میں تیل بھرنے لگا۔ تیل بھر چکا تو پھر ایک سرے سے تیل کے پیسے بھی وصول کرنے لگا۔ ہر دوکاندار سے چھ آنے مل جاتے تھے۔ ایک خاکی کپڑے کا چھوٹا سا تھیلا سینے کے آر پار باندھ لیا۔ جس کے اندر ریزگاری تھی۔ وہ ہر دوکان پر جاکر تھیلے کے اندر ہاتھ ڈال کے ریزگاری چھنکاتا اور کہتا۔

"چھ آنے سیٹھ جی —"

"شاہ جی چھ آنے —"

اچانک ایک لڑکا اُس کے سامنے آکر بولا۔

"لے سردار! چل مالک بُلاتا ہے۔ آج سے اُن کا گیس بھی بھر دیا کر۔"

"کون ہے تیرا مالک؟"

وہ لڑکے کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن دور ہی سے جلد سازی کی دوکان دیکھ کر لوٹ آیا۔ وہاں حکم چند بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ کمینہ کہیں کا! یہ سب اُس کی بہن کی وجہ سے تھا۔ بہن اُس کی کتنی بڑی توہین کرا رہی تھی! گھر جا کر وہ ماں سے خوب لڑے گا یہ سوچتے سوچتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جلدی جلدی وصولی کرنے لگا۔

جس دوکان سے اُس کی ماں نے اُدھار کپڑا لیا تھا اُس کے مالک نے پوچھا۔

"ماں نہیں آئی تمہاری؟"

"ایک مہینہ ٹھہر جاؤ سیٹھ جی۔ پچاس میں نے جمع کر لیے ہیں۔ چالیس کی سلائی آ جانے کی اُمید ہے۔ اِس مہینے بھی تیس چالیس بچا لوں گا۔"

"تو یہ سب ملا کر کتنے ہو جائیں گے؟ اُدھار تو ساڑھے تین سو کا ہے!"

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ بولا۔ "کل ماں کو بھیجوں گا۔"

"ہاں، کل ضرور بھیجنا۔"

وہ بہت اداس سا گھر لوٹا۔ کاش آج اُس کا باپ زندہ ہوتا۔ وہ دوکاندار اور حکم چند کو مزا چکھا دیتا۔ اُس نے اپنے باپ کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ ماں اُسے بتایا کرتی تھی کہ وہ بالکل اپنے باپ کا ہمشکل تھا وہ خوب کلف دار چوڑی پگڑی باندھتا تھا۔ ڈاڑھی مونچھوں کو فکسو سے جماتا تھا۔ کوٹ پتلون پہنا کرتا تھا۔ جب وہ بڑا ہو جائے گا۔ اُس کی بھی ڈاڑھی مونچھ

نکل آئے گی تو وہ بالکل اپنے باپ کی طرح دکھائی دے گا۔ وہ کبھی کبھی اپنے چہرے پر گھنی اور کس کر جمائی ہوئی ڈاڑھی مونچھ کا احساس بھی کرنے لگتا۔ سر پر بڑی سی مٹیالہ اسٹائل پگڑی، جسم پر بہت ہی خوبصورت سوٹ کا!

جب گھر پہنچا تو ماں رسوئی میں کھانا لیے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن اُسے بالکل بھوک نہیں لگی تھی۔ ماں کے بہت اصرار کرنے پر وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا کھانا کھاتے وقت وہ بہت سی باتیں سوچ رہا تھا۔ وہ سب باتیں ماں سے کہہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن ہر بار بات اُس کی زبان تک آ کر لوٹ جاتی تھی۔ آج اُس کی ماں کے چہرے پر بھی ایک گہری افسردگی دکھائی دیتی تھی۔ جانے کیا بات تھی! شاید اس لیے کہ وہ گھر سے جاتے وقت بہت سخت لہجے میں کچھ کہہ کر گیا تھا۔ درشن کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہ کہاں تھی؟ اِدھر اُدھر دیکھا وہ اندر کمرے میں چادر اوڑھ کر سوئی ہوئی نظر آئی۔ شاید اُس نے ماں کی اور اُس کی گفتگو سُن لی تھی۔ شاید اسی لیے ماں بھی اُداس تھی۔ لیکن ماں بیٹا خاموش رہے۔ کسی موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔

اجیت کو گھر کے اندر ایک عجیب سی بے کیفی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا گھر کا کوئی فرد وہاں سے چلا گیا ہو۔ کون چلا گیا تھا؟ کوئی بھی تو نہیں؟ کوئی گیا بھی تھا تو آج سے بارہ سال پہلے۔ اُس کا باپ۔ جب ہندوستان تقسیم ہوا تھا لیکن اُس کی کمی آج کیوں محسوس کی جا رہی تھی؟

جب گھر میں اُس کا جی نہ لگا تو وہ ردّی اخبار اُٹھا کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹا تو اُس کی جیب میں کچھ روپے اور ہاتھ میں ایک رنگ برنگی تصویر دل

والی کتاب تھی۔ وہ سیدھا درشن کے پاس گیا۔ وہ منہ پھیر کر لیٹی ہوئی تھی۔ اُسے ہلایا تو اُس نے ایک بار ذرا سی حرکت کی لیکن پھر اُسی طرح پڑ رہی اُسے پھر ہلایا آپس میں نہ بولنے کی تو اُنہوں نے قسم کھائی ہوئی تھی۔ اجیت نے اُسے پھولوں والی کاپی دکھائی ایک لمحہ کے لیے درشن نے سر گھما کر کاپی کو گھورا۔ اُس کی آنکھوں کے نیچے گالوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ اجیت کی آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں۔ وہ اس کے ساتھ لیٹ گیا اُس کا جی چاہا۔ درشن اُسے وہ گیت سُنائے۔ اپنی میٹھی آواز میں ــــ گا کر ؎

انگے نی مائے انگے

مرے ست بھرا منگے

میرا اک بھرا کنوارا

اوچلی کھیلن والا،

اُس نے درشن کو کتاب کا ایک ایک صفحہ کھول کر دکھا دیا۔ کاڑھنے کے لیے پھولوں اور بوٹوں کے بے شمار ڈیزائن تھے۔ درشن اُسی طرح سر گھمائے لیٹی رہی۔ دونوں میں سے کوئی نہیں بول رہا تھا۔ اُنکی ماں اپنی چارپائی پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ ورنہ روزانہ اس وقت کیروسین لیمپ سامنے رکھ کر وہ مشین چلاتی تھی۔ اجیت سے نہیں رہا گیا تو درشن کا چہرہ اپنی طرف گھما کر بولا ــ "درشو، تو حکم چند کے ساتھ بیاہ کرے گی؟"

یہ سُنتے ہی درشن نے اُسے پوری قوت سے پرے دھکیل دیا۔ غصّے سے بولی۔

ہٹ! "تیرے منہ میں ــــ"!

اجیت کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ بالکل اچانک! اور اُنکی ماں چونک کر دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

رام لعل میں وہ ساری صلاحیتیں موجود ہیں جو انھیں
چوٹی کا افسانہ نگار بنا سکتی ہیں۔ نظر میں گہرائی ہے۔ طبیعت
میں نفسیاتی اُلجھنوں کے سمجھنے کی خاصیت اور بیان میں
وہ سادگی جو اپنے دامن میں بڑی رنگینیاں چھپائے ہوئے
ہے۔ وہ جن کرداروں اور جس ماحول کو اپنی کہانی کا مرکز
بناتے ہیں اس کا بغور مطالعہ اور صحیح نباضی کرتے ہیں۔ وہ
جزئیات کو بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں اور اُن کو
بڑے فنکارانہ طور پر ایک لڑی میں منسلک کر دیتے ہیں
مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اسی لگن سے لکھتے رہے اور ہماری
معاشرتی، اقتصادی اور نفسیاتی گتھیوں کی ایسی ہمدردانہ
عکاسی کرتے رہے تو وہ ایک دن اُردو کے سرت چندر
چیٹرجی بن جائیں گے۔

علی عبّاس حسینی